سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

دیوان طباطبائی

یعنی

صوت تغزل

۱۹۳۳ء

مجموعہ کلام

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظم

ناشر

انجمن ادبا ہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

دفعہ اول (۱۰۰۰) | سنہ ۱۹۳۳ء ۱۳۵۱ھ | قیمت عا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادب الکاتب والشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہوجاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کھیتوں یا چوسر کے پانسے میں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی نکل آتی ہے۔

یہ دو لوحیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دو میل راہ میں جو مضمون کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔

غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اس کی قسمت کا جو سہم ہے نکل آتا ہے۔

قافیہ و ردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے۔ ؎

لے گئی عرش معلیٰ پہ مجھے فکر سخن
جا پڑا پر تو آئینۂ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا ؎

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھالی ہے
آواز پر ہے شورش محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ؎

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا گر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ (کا) ردیف ہے اس میں زبان کا مزہ دیکھیے ؎

اٹھنا ہی اسکی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالا دل بے اختیار کا

شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا ایک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے قافیہ کا ہونا نہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے معنوی اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اوس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ و ردیف سے رستہ تبائے غزل گو کو اسی طرف جانا چاہیے مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لے گیا اور بس نے اوسے مقتل کی طرف کھینچا اس وجہ سے مسلسل غزل میں تسلسل باقی نہ رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو بیان کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہوگئیں مثلاً (ا) شاہزادہ رخصت مانگ رہا ہے ملکہ سے قلق نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے ؎

منہ سے بولی نہ کچھ وہ غنچہ دہن
پاؤں سے پرو بالیا دامن

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آگیا (۲) یا جیسے دو شاہزادے عون و محمد شہادت کے شوق میں نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آجانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہو گئی تھی (۳) یا مثلاً حر کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

جھپیوں اڑتے ہے دب کے فرس نوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے کنبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آجانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔

غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعر یہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر
الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اوسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہ کن و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے۔ غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المغربہ جاحظ نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا۔ البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آج تک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغۃ لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغت کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی اور گلے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے گوہر شاہوار چن چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علماء نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ متین کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلاد اسلام میں جا بجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازاں نے بذل جہد کرکے اس متن متین پر شرح لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کردیا عرب سے لے کر ہندوستان و سمرقند سے لے کر جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہو گئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کرکے فن بیان علمانے اس امر کی تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عاشقانہ اور رو دہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرزِ بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرزِ بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرزِ بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عاید ہوگا۔

طرزِ بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فنِ بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حدِ اعجاز تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے ؎

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرز ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذ آتش زدہ مہمان بقائیم
طاؤس پر افشانِ چمن زار فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گرد ول شدہ قمری پرواز
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

بیدل نے بے ثباتی عمر کے بیان میں کاغذ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے غالب نے جوش بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام سے اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کئے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔

غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ع

تپد در آئینہ جوہر چو ذرہ در رو زن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پرافشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرّے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پرافشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بستی و ہشیاری آزمود مرا

زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھیے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی بمثل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سید محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

کرتی ہے بوئے گل تو مری ساتھ اختلاط ۔ آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں ست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط سب کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینیسن کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطر دانوں کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینیسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھے مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہالوں کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔

بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو سلام میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں مدح کی بتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔

طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے اور

ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلےٰ پایا

کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دُعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا

رگِ گردن سے اقرب آسمان کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بار ہا پایا

نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہ بے نقش پا و کاروانِ بے درا پایا

تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

متعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سے ہے
دل بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا

خدا اگر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصل ارض و سما پایا

نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا

گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو در سے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا

خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا

بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ اسے دیکھا اسے رنگ حنا پایا

جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اسکا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مثل نرگس کے عصا پایا

چلی ہے سل کچھ آزردہ چیں بر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں کیوں آئی تھی جو اک بوریا پایا

نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا بھی تو شور و رہا . . . پایا
زمینِ شعر پر اے نظم ہم بھی شب کو گزرتے تھے
اٹھا لائے ہیں دامن میں سے جو کچھ پڑا پایا

(۹)

(۲)

کلامِ حق ہے توریت اب مجھے یہ اعتبار آیا
خبر موسیٰ نے جسکی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ بادِ گزرا اور مانندِ شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک فتراک کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دانہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کو پلٹ پھول شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوے بہت ہیں اور مہلت دید کی کم ہے
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرار آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر فرد و بشر یاں
وہ مہماں کیا بن کر جو لباسِ مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاوس پر آخر وہی نقش و نگار ... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت درِ توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمیدوار آیا

(۱۵) ۳

جہاں کو مژدہ اس جانِ جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرعِ ثانی ہے جس کے مصرعِ قد کا
ہُوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمدؐ کا
طلسمِ عالمِ امکاں تھا یا رب قفلِ ابجد کا
مواعظ کے گہر عالم میں بکھرانے کو نور اسکا
اوبھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہے دل ہر اک قسیس و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلّی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمدؐ کا

(دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کھا تین ۱۲
(دفت میں موبد اور موبد دونوں طرح آیا ہے ۱۲)

تری رفتار میں بیشک ہے اعجازِ مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا

براق تیز تگ جب طارم افلاک سے گزرا
تو مثل گرد رنگ اڑنے لگا چرخ زبرجد کا

تجھے معراج کی رفعت ہے فرش خاک پر حاصل
سریر عرش اعلیٰ تکیہ ہے تیری مسند کا

جبھی سے عالم اسرار علم کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتی تھے ابجد کا

دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا

ملا اللہ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا

مسیر فرش تا عرش اک قدم مرکب کا ہے تیرے
مقام قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا

تعالیٰ اللہ ہے اس شاہ کی شان کرم ایسی
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

لہ رسول اللہ منافقوں میں گھرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

نہ چھوڑے گا وحید کو اب نظم ثنا گستر
یہی در ہے رسول اللہ کے شہر علم بے حد کا
کہاں ہے کعب سکھے ہم سے آئین ثنا خوانی
کہ نعت مصطفےٰ اور ذکر شمشیر مہند کا

(۱۴)

(۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گذرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالم اجسام میں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو دونوں جائے عبرت ہیں
یہ مقتل نیزہ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرک سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہے اگر تو اک مرجع سب اشاروں کا
کرم ادنیٰ یہ اعلیٰ سے زیادہ ہے تعالی اللہ
گلوں سے یہ مشیر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

لہ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف اللہ کا لفظ آنحضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہے
غبار اونچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا

ضلالت میں گھرے ہیں اور علائق مانع عرفاں
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہے کوہساروں کا

بہت جلدی کی تو نے کوس رحلت کے بجانے میں
کہ میں نے اے اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا

شرار و برق کی فرصت سے کم ہے فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے بھرنا تراروں کا

ہوا میں ان کے ذرے ہوں تو ہوں جو نامور گزرے
پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا

بہانہ ڈھونڈھتی ہے اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا

کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا

کھلا دیتی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

منجم بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبوں میں

یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۱۹) (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا

اجل بھی دیکھ کر آفت میں کر جاتی ہے رم اچھا
بھلا کب تک چھپائیگی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا

مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے - اٹھنا دم بدم اچھا

دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہے یا صید حرم اچھا

چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ پر اٹھرا رہا نقش قدم اچھا

رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامۂ دیر و حرم اچھا

بگڑنا قہر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا

نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور ترے سر کی قسم اچھا
جواب صاف دیکر توڑتے کیوں ہو مری دل کو
مجھے لیت ولعل اچھی مجھے لاو نعم اچھا
مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے
مقدر میں نہیں ہرگز خیال بیش و کم اچھا
نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر
کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا
نفس دزدیدہ جانا خوابگاہوں میں حسینوں کی
نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا
کوئی پوچھے ذرا وارفتگان حسن سے اُس کے
وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا
درانداز وں کو سمجھائے کوئی للہ پوچھے تو
ملال آپس کا اچھا مل کے یار رہنا بہم اچھا
مناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں
سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا
اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامۂ ہستی
تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

لحاظ اتنا ابھی تک حضرت ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا

نہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا

روانی کو کلام نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۱۵)

(۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگاتا ہے ہوا میں آگ اڑ کر رنگ گلشن کا

جو نازاں مردم آزاری پہ ہو اسکو یہ دو مژدہ
اجارہ چونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن ... کا

جنازہ جس گھڑی پہنچا لب مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا

نہیں ہے کار فرما تیغ و راست کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ سر پر شکر شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی خون کی ندی نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کس طرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہم کوئے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جس کی نگاہوں سے
کوئی میری طرف منہ پھیرے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں میں ناصح مزاج اپنا ہے الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں اس بلبل سے میں نے باتیں مجھ سے ناصح نے

(۷)

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیث معنعن کا
وطن کا حال پوچھا اے نظم تو سیل حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشان اپنے نشیمن کا

(۱۲)

تجمل دیکھ کر تیرے شہیدان محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوز فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشید قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوز فرقت کا
رہا مہر درخشاں کو بخار اور کیسی شدت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہی انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دور گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہر خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آکر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے گزرا کہ اب معلوم ہوتا ہے
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصہ ایک مدت کا
فغانِ آبشار و اشکِ ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہے اپنی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں راز پنہاں رہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہے میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجالِ دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہے اے حیدر
بگولے رقص کرتے ہیں مٹا کر نقش تربت کا

(۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بت خانہ جو نقشِ ماسوا ہوتا
تجھے یکتا سمجھ کر نازِ یکتائی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کر کے اس قدر لی چٹکیاں میں نے

(۸)

گلِ خودرو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا
کیا تہ جس نے زانو مسندِ الفقر فخری پر
نہ کیوں نقشِ سلیماں اس کا نقشِ بوریا ہوتا
نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری میں نظر سے گر گیا ہوتا
وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو کاٹیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا
مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا
تھکا مارا تلاشِ منزلِ مقصد کا ہوں حیدر
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۱۷) (۹)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر الٹا
نگاہِ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گئی یہ جادو اگر الٹا
بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا
موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں نوبتی نے وردیاں الٹی کمر الٹا
وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو میں تاہوں
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دہر دیگی کمر الٹا
صبا کی شوخیوں پر رشک کیسا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بیخوف و خطر الٹا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زبان کو کس قدر الٹا
وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دوں
کلیجہ تھام لیں بلکہ کرے تیر نظر الٹا
کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شبیں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا
گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریف کینہ جو کے ہی کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا مشتر الٹا

بہارِ باغ دونی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لبِ دریا تماشا انقلاب دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سے ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہر مبیں سیدھا قمر الٹا

جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہو سچ بات وہ انظم دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہی یکساں رکھیے سیدھا یا گہر الٹا

(۱۰)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
زہے گم کردہ منزل رہ زنوں کو راہبر جانا

ہمیشہ ہمتِ عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

(۱۹)

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوف رسوائی
شکستِ رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شور و شر جانا

یہ میری سادگی اے عمرِ رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہمرکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے ملکِ خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیر کمر جانا

شعاعِ رنگ کو سرگم[1] میں سمجھا سازِ ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمہ تارِ نظر جانا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتی ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاجِ زر جانا

ذرا سی آبرو جو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں نے اسے آبِ گہر جانا

مصائب بھی جہاں کے بے ثبات ایسے نظر آئے
کہ میں نے آفتابِ حشر کو شمعِ سحر جانا

مجھے وارفتگی پر نشۂ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے کچھ بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

[1] سرگم کے سات سُر جس طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعاع [illegible] رنگ تارِ نظر پر [illegible] ہیں ۱۲

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے جلوہ کو
باندازِ دگر دیکھا بہ عنوانِ دگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑکے چھتی میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھلوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دورِ قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رختِ سفر سمجھا اسے گردِ سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیرِ آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبارِ رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقصِ شرر جانا

مثل ہے نظم جو سو یا وہ کھویا حسبِ حال اپنے

شب قدر آج ہی تھی ہم نے یہ وقتِ سحر جانا

(۱۱)

ادا میں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا

کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا

نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی مروت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا

تمھاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہتے بنی ہم کو
گلا نالے نے گھونٹا منہ شکایت نے مسل ڈالا

فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا

جدا ہے پاؤں سے زنجیر تھپڑ دور ہے سر سے
رفیقان کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا

نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں گھن بھی دل ڈالا

شکن ماتھے پر آئی اب بھلا کیوں رخ کو کھولے

تعلی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا
موذن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شب عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا
بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل چٹکی سی مل ڈالا
علائق میں پھنسا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظم آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(۱۲) (۲۰)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا
چھلاوا بن گیا توسن کسی کا
نہ کر نامہ شکار افگن کسی کا
نہ رکھنا تسمہ گردن کسی کا
وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا
وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا
نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی
تبسم صاعقہ افگن کسی کا
چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی پر
کرے گی خون یہ چتون کسی کا
اٹھے اس رہ میں صد ہا گرد بنکر
نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا
ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے
گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا
کسی کے قصر پر کیوں کیجئے رشک
سر ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا دو گز کفن گردوں نے بھی ڈھکا جس سے نہ دو دن تن کسی کا
کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا
نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز وہ نازک ہاتھ اور مدفن کسی کا
غبار کاروان بیخودی ہوں نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا
چڑھوں میں عرش پر کیوں ہل چکا ہے پتا قرب رگ گردن کسی کا
گنہ کوئی کرے ملزم میں ٹھہروں کسی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا
درازی زلف کی ہے وہ زافروں لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا
مجھے چاک قبائے گل نے مارا یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا
دکھایا میں نے آئینہ تو بولے ستم ہے آج تو جوبن سے کا
زوال حسن پر ہے لوچ باقی ڈھلا سانچے میں ہے جوبن کسی کا
زہے رحمت پسند آئی جو اس کو سر سجدہ خم گردن کسی کا

زخود رفتہ ہے بجلی آج اے نظم
اسے کیا مل گیا خرمن کسی کا

(۱۳) (۱۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

بڑے معرکے سے ہے آیا ہوا لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
گہر ہے کہ صبح بناگوش میں ستارہ سا جھلملایا ہوا

وہ عیار نظروں سے اوجھل بھی ہے — پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا
نہ اے پیر تو مجھ سے تو لے نہیں — کہ میں ہوں فلک کا ستایا ہوا
سزاوار رحمت ہوں میں اے کریم — کہ آیا ہوں تیرا بلایا ہوا
غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ — گناہوں کی ظلمت سے سایا ہوا
نظر جب سے آئی ہے زلف سیاہ — اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا
جنوں سر پہ جن کی طرح ہے سوار — اجل کی طرح دل ہے آیا ہوا
خوشی میں نے تیری بہر حال کی — خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا
رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی — یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا
چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ — کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا
چھڑکتے ہیں وہ اس ادا سے گلاب — کہ جاتا رہے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہے دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۹)

(۱۴)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا
تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا
لے کے مشتاقوں کو شوق بزم جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا
بڑھتے بڑھتے کس قدر طومار عصیاں بڑھ گیا

چند دفتر قصۂ خواب پریشاں بڑھ گیا
سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹنوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا

کچھ تلاطم میں تھی خود بھی کشتی عمر رواں
دل کے کچھ پیہم دھڑکنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا

روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغ مہر تاباں بڑھ گیا

سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائے وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا درد ہجراں بڑھ گیا

دیدہ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سرخ
کس قدر اس عہد میں آشوب دوراں بڑھ گیا

آرزو یہ تھی کہ آ جائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مرا نو کا گریباں بڑھ گیا

یہ تو چمکی بار بار آنکھیں اسے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزۂ عمر گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میری دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا

تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا

اہلِ کشتی کو مسرت ہے چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا

ہوگا خود ساماں پیدا چاہیے کچھ دل میں جوش
شورشِ فریاد سے برچھوں نیستاں بڑھ گیا

سچ یہ ہے جس روز بسم اللہ مکتب میں ہوئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ بتاں بڑھ گیا

تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھ کر
پاؤں پھیلانے میں دامن سے گریباں بڑھ گیا

عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا

ابنِ مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
سو قدم ان سے مرا عیسیٰ دوراں بڑھ گیا

یاد ہے اے نظم مصرع ناسخ مغفور کا

سو چمن آگے مرا سرو خراماں بڑھ گیا

(۱۵) (۱۱)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا

داغ دل چمکا جو اس کے طالب دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغ طور شرمایا ہوا

عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتی ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سے ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا

دل بھی ٹوٹا بلبل ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامن گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا

کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا

آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہ ہے ارشاد فرمایا ہوا

دیکھے تسکیں اس نے اعجاز مسیحائی کیا
رہ گیا قالب میں دم ہونٹوں تلک آیا ہوا

بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ دب دب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سونے میں دم گھٹتا تھا نظم
آج دامانِ کفن منہ پر ہے دُہرایا ہوا

(۱۶)

(۲۱)

بسکہ سیلابِ فنا دارِ محن ثابت ہوا
بلبلہ پانی کا یہ چرخِ کہن ثابت ہوا
نقشِ باطل جب خیالِ ماو من ثابت ہوا
دھر میں انسان آوارہ وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خونِ بے گناہ
او قدر انداز او ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگِ خرمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہو گیا محشر میں بھی

یوں اڑی رنگت کہ دامانِ کفن ثابت ہوا
رات کو یہ وہم تھا ہے عارضِ روشن پہ نیل
صبح کو وہ نقشِ برگِ یاسمن ثابت ہوا
سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دلآزار اُس کو حیف
دلفریب و دل ربا و دل شکن ثابت ہوا
دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی
کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا
اب کے ہے فصلِ جنوں میں ناتوانی اس قدر
پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا
ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت
جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا
دوش پر بکھرے جو گیسو یہ پھڑک کر رہ گیا
دل اسیرِ دامِ زلفِ پر شکن ثابت ہوا
سُرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر
خونِ گردن پر تری اے برہمن ثابت ہوا
جی گیا آنے سے اس کے مر گیا جانے سے میں
مجھ میں اس میں ارتباطِ جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اُس عالم میں تن ثابت ہوا

سختیاں جھیلے نہ کیوں انسان دنیا کے لئے
کوہ کن پر کب فریب پیر زن ثابت ہوا

شوق میں اس جلوہ گہ کے مہر عالمتاب بھی
مثل اک ذرہ کے آوارہ وطن ثابت ہوا

زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتۂ دار و رسن ثابت ہوا

جھک پڑی چہرے پہ لہرا کر جو زلف پر شکن
شاخ سنبل کا ثمر سیب ذقن ثابت ہوا

قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دہواں
ایک مور ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا

سر پہ تیشہ طرۂ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا

وقت بد میں ہر طرف سے چشمکیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جا بجا سورج گہن ثابت ہوا

آپ کی محفل میں آکر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سد سکندر لے چلا

دیدۂ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدھر اٹھا بسان موج بستر لے چلا

دل صفِ مژگاں کی جانب سی مکدر لے چلا
میں بھی سرمہ کی طرح سے گرد لشکر لے چلا

سامری کے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آکے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا

روزِ محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا

نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا

آکے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف ابرِ دریا بار لشکر لے چلا

دیکھنا صبحِ شبِ عیش اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا

زلف برہم ہو کے الجھی چٹکیاں نکل نے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا
میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثل ابر و برق
کروٹیں دو چار ابھی لی تھیں کہ بستر لے چلا
میری پلکوں سے روانی اشک خون کی دیکھ کر
ابر تر آ کر رگ سودا پہ نشتر لے چلا
ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے
طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا
بھاگ گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب
آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا
میں تو سمجھا تھا عدم سابق بھی ہے لاحق بھی ہے
ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا
میں ہمہ تن آہ و نالہ خواب مرقد سے اٹھا
استخواں ہر ایک اپنا صور محشر لے چلا
کاروان گل چلا آخر ہوئی فصل بہار
سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا
وقت آخر آشکارا ہو گئے سب دل کے داغ
خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بوشگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوشِ جنوں جامہ سے باہر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۱۸) ولہ (۲۱)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
ہیں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا
دل کو ٹکڑے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترک ستم ایجاد کا
لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد . . . کا
جانتے ہو پوچھنے سے حالِ دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا
تھا منا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا
ظلم سہ سہ کر بنایا خود اسے سفاکِ خلق
داورِ محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطامے کے لئے
ڈھل گیا دن دور تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑ گیا غل اہل محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولہ اٹھ کے دیتا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر جستہ ہوں میں غربت ہے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا مل گئی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکر میں شوق قتل میں

خنجرِ قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا
ہائے کیا سہما ہوا تھا نالۂ مرغِ چمن
رہ گیا بن کر چراغ ایک خانۂ صیاد کا
لشکرِ بادِ بہاری اور جنوں کی کشمکش
گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا
شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکلِ عروس
ذہن میں لاؤں کہاں سے باقرِ داماد کا
دیدۂ فتاں نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں
اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا
اے فلک اس گردشِ بیجا سے کیا حاصل ہوا
شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا
پاس میرے تم کو تو آتا نہیں یک دم قرار
ہے تعجب دل میں رہ جاتا تمہاری یاد کا
نظم نے آخر گورا کر لیا داغِ فراق
دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

۱۵

ہرزہ گردی سے قدم سودی سے سر پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا
وہ کھلیں کلیاں وہ مہکے پھول دے جلدی شراب
وہ ہوا آئی وہ ساقی ابر تر پیدا ہوا
عشق کا تیرے اسی دن سے ہے میرے دل میں داغ
پرتو خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا
خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے
جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا
ہر گھڑی لپٹائے رہتا ہوں کلیجے سے اسے
دوسرا معشوق یہ داغ جگر پیدا ہوا
دل کو بھی آخر ہے عادت الجھنوں کی ہو گئی
گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا
میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جائیں حضور
نالۂ بلبل سے آخر درد سر پیدا ہوا
ہاتھ پھیلانے [illegible] برگ کچھ حاصل نہیں
دیکھ غنچے کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا
آتش الفت ہی کس غالب [illegible]
طور جل کر رہ گیا ایسا شرر پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اے زاہد سیہ کاری مری
ابرِ رحمت سے مرا دامن تر پیدا ہوا

میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخلِ ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا

آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا حق کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا

میری مٹی میں نہاں ہیں مثلِ اخگر سوزشیں
خاک جب سر کی ذرا داغِ جگر پیدا ہوا

طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
ناحقیقت میں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا

ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قد رسا
شکر ہے ملکِ عدم کا نظم ور پیدا ہوا

۱۹ ولہ ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہو جائے گا
جامِ ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا

آ کے میخانہ میں جو غفلت گزیں ہو جائے گا
دورِ گردوں اس کو دورِ ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سیدھا اک سجدہ میں اے نقش نگیں ہو جائے گا

دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبورِ غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا

بارِ عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا

لے چلی تختِ رواں سے خاکِ مدفن میں فضا
دیدۂ مورِ اب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہہ دے گا یقیں ہو جائے گا

کچھ تو رہنے دے قیامت کے لئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پر ہیں ہو جائے گا

خود نمائی اس قدر منبر پہ واعظ خیر ہے
نازیہ کرنے سے کیا تو نازنین ہو جائے گا

خامہ و ذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا

تو ستارہ کو مرے اے پستی طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیرِ زمیں ہو جائے گا
آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یا یہ انگبیں ہو جائے گا
کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقشِ دل میرا نگیں ہو جائے گا
بزم میں بے تیرے پہنچائیگا ساغر چشمِ زخم
خط پیمانہ نگاہِ نکتہ چیں ہو جائے گا
بحث رندوں سے نہ کر جا کے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا
تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخِ یاسمیں ہو جائے گا
پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ ابھی
کشتۂ تیرِ نگاہِ سرمگیں ہو جائے گا
زلف گر ہو کر پریشاں کروٹوں میں آ گئی
کھا کے بل موئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا
دردِ دل کا نظم کو رہتا ہے روز و روز
جان سے بیزار اک دن ہمنشیں ہو جائے گا

۸ ۳۱

دل نے پھر وارفتہ حسن بت پر فن کیا
اشک خون نے پھر چراغ آرزو روشن کیا

چھوٹ کر تیرا اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تو نے اے شکار افگن کیا

بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ اس نے جانب گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جم کے مستی نے لبوں کو غیرت سوسن کیا

شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آکر خانہ تاریک کو روشن کیا

وعدہ مرنے کے بھی میں ایسا ہوں دشمن کام خلق
شمع نے گریہ ناک دن بھی سر مدفن کیا

ہے نگاہ یار شوق روزن دیوار یار
مثل دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا

کون سنتا ہے فغان درویش کی ہم نے تو نظم
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲ ——— ۱۱

اس نے دکھلا کے جھلک اپنی جو دیوانہ کیا
طور پر جا کے ادا سجدۂ شکرانہ کیا

تو نے حیرت زدۂ حسن کو دیوانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوہ نے پریخانہ کیا

منزل دہر نہیں چھاؤنی چھلنے کا مقام
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا

خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتا ہے
سبز موتی کا نہ بارش نے کوئی دانہ کیا

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
قدر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا

آج گردوں نے کیا شہرۂ آفاق جسے
کل اوسے محفل احباب کا افسانہ کیا

کم نہیں دل سے تڑپنے میں سویدا دل کا
اسی اسپند بنایا اسے پروانہ کیا

پھیرنا آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا

اس کے تو سلسلۂ زلف میں آواز نہیں
گوش زد یار کے کس نے میرا افسانہ کیا

سادگی آگئی جس دن سے گیا عہد شباب
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا

الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یلانہ کیا

۲۳ ——— ۱۶

کھینچے آئے گا سینہ سے جو پیکاں اپنا
پھر بچانا تجھے مشکل ہے گریباں اپنا

اٹھ گئی کشتی مے بزم سے ہنگام سحر
دن چڑھے تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا

اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
کچھ پتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

حشر کے دن بھی میں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ موجوں کی طرح پڑ دے
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں ایسا تو نہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمائے شب ہجراں اپنا

کی جو آنکھ کی طرح گرد دلکدورت پیدا
مل گیا خاک میں آخر دل سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب نے ادبوں سے ہے مجھے
ہے خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہے
خود بخود چاک ہوا ہے جو گریباں اپنا

اپنے ہی پاؤں میں چبھتے ہیں جو بو دو کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا کرتا ہے احساں اپنا

جوش وحشت میں بھی پابند قناعت ہوں میں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدہ حیراں اپنا

روز محشر کی بھی ایذا میں اٹھاؤں گا مگر
منہ دکھانا نہ مجھے ای شب ہجراں اپنا

سر بزانو ہوئی جب آپ میں رہتی نہیں ہم
جادۂ دشت ہے ہر بخیۂ داماں اپنا

لی خبر حضرت ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربت مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حیدر
آشیاں اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۲۴ ——— ۱۴

ہر سحر مرغ چمن شور مچانا تیرا
زخم دل پر ہے نمک ریز ترانہ تیرا

کبھی ہنسا ہے جو بھولے سے بھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شب غم میں رلانا تیرا

کس کا شکوہ کروں کس کا نہ کروں شکوہ ہے
آسماں تیرا زمیں تیری زمانہ تیرا

ای فلک خبر ہوں آگاہ روش سے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے اے فصلِ جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ دردرسیدہ ہوں میں اے شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نہ پھیرلے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
اے اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار اے بلبل
پر اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

پھر وہ کوئی پھر تجھ سے ملے کس دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

اے جنوں سچ ہے گلا کاٹ کے مرجاتا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر انہیں بھی ہے جو بیٹھے ہیں پر بال
جب سے دیکھا ہے شانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا ہے نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت روئیں ہیں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے دہانا تیرا

تا کجا شرح غم و درد خدا را حیدر
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ ——— ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آپہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دلآزاری پر
نہ گریبان تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی ہیں
میری آنکھوں میں اندھیرا ہو اور پہنچا

ایک جواب سے لکھا بھی تو لکھا صاف جواب
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرف بھی کوئی بھولا کوئی بسرا پہنچا

خاک مرقد میں وہ ہی جذب کہ تم سن لینا
گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا

گوشہ گیری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے
کہ نہ اس کے پر پرواز کو عنقا پہنچا

چاہتا ہی نہ رہے خواب گران غفلت
دل پر اک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا

اس کے دربان نے کہا دیکھ کے زنداں میں مجھے
دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا

جلوہ شاہد معنی ہے حریم دل میں
آنکھ جب بند کی ماند نظر جا پہنچا

شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ سے الجھے
پڑ گئے زلف میں بل ہاتھ کو جھٹکا پہنچا

شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو
شکر ہے شکر اس آفت سے بچا پہنچا

مسند فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا

۲۶ — ۱۱

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں نہ ہوا
وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا

قابل مہر و وفا دشمن ایماں نہ ہوا
ہائے کافر کو نہ ہونا تھا مسلماں نہ ہوا

کب سر زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا
حیف وہ دل کہ حریف خم چوگاں نہ ہوا

ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا
برق کہتی ہی کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا

ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز
مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا

دل کا سب راز ہی عنوان جبیں سے ظاہر
لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا

حلقہ دل زدگاں میں تھا گذر ناصح کا
آج اس بزم میں وہ فتنہ دوراں نہ ہوا

ڈھا دیا دستِ اجل نے تو قضا نے لوٹا
کاغذِ باد ہوا تختِ سلیماں نہ ہوا

ساری عالم کا تو معشوق تھا اے حسنِ شباب
کس کا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا

مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ مجھ کو نہیں
شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکرِ پاداش نہ کچھ شرم گنہ حیف اے نظم
سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ ——— ۱۴

مختصر مرحلۂ طول امل کیا ہوگا
قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا

آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا
سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگیِ دل کہ ابھی تک ہے وقت
ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حرکتِ مرغ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے
ورنہ بے صوتِ حدی رقصِ جمل کیا ہوگا

چاہیے گوشۂ دل وادیِ ایمن ہو نہ طور
جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا
میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا

دیکھ کر زخمِ جگر کو مرے کہتا ہے رقیب
جس کا یہ پھول ہو اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی
اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

حسنِ نیت تو ہے زاہد کا سبھوں کو معلوم
دیکھنا ہے اثرِ حسنِ عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم اب توڑ کے پاؤں
ہاتھ منت کشِ اربابِ دول کیا ہوگا

تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے
اس سے بڑھ کر مزۂ قند و عسل کیا ہوگا

بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں بڑھتی
اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا

نظم اک آنی و فانی ہے پھر اس سے ناراض
خالقِ لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

(۲۸) _____ (۱۵)

سرو کی طرح اگر بزدہ و اماں ہوتا
مثلِ غنچہ کے نہ میں سر بگریباں ہوتا

رشکِ فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا

کاشکے پیشِ نظر مجمعِ خوباں ہوتا
اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا

مار ڈالا ہے زمانہ کی دو رنگی نے مجھے
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا

ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں رہیں تکیں
نقشِ پا کوئی تو اے عمرِ گریزاں ہوتا

چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا

مرغِ بسمل ہوں نہیں میرے تڑپنے کا علاج
چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا

حلقۂ تدویر کو اک کے مسلسل رہتے
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

تھا وہ اس عالمِ اجسام کی لیتا کوئی
قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا

اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے قائم
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالمِ امکاں ہوتا

ڈر تھا سوزِ غمِ ہجراں کا مجھے اے واعظ
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں سے فلک انگشت بدنداں ہوتا

تجکو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوز غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا

زاہد خشک بتا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی میخوار اگر دست و گریباں ہوتا

دل کا ارمان نکلنا تو ہے مشکل اے نظم
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۹ ——— (۱۵)

آنکھ پھرنے میں جو رخش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہوں سے زیادہ رم آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاش کے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غم عشق
نیل ڈھلنا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا

ہم سمجھتے کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
اگر اپنے دل بیتاب پہ قابو ہوتا

پیچ گھونگر نے جو ڈالے ہیں اگر کھل جاتے
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا

اثر کاہ ربا دل کو ہوا ہے حاصل
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا ہے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی نہ الٰہی نہ لب جو ہوتا

دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
برج میزان کے لئے سنگ ترازو ہوتا

میرے نالے جو شب تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

پر خطر تھی شب ہجراں کی سیاہی ایسی
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا

آئے گلزار میں صیاد کو نیند آجاتی
شاخ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا مگر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں ڈوب کے نکلتا ہے چاند
بام پر سر کو جو نیو ہڑائے ہوئے تو ہوتا

سر بہ بھی دیدۂ فتاں میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظم
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۳۰ ——— ۱۸

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا

دل کے آئینہ میں ہم نے رخ جاناں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیٰ عمراں دیکھا

زیست میں چار طرف مرگ کا طوفاں دیکھا
تند آندھی میں چراغ تہ داماں دیکھا

تھمنے پایا نہ قدم طول امل کے ہاتھوں
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا

رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے موج
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا

پاؤں سے مور ملخ کے جو اٹھی گرد ذرا
میں نے اسمیں بخدا تخت سلیماں دیکھا

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زباں منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو وہ احساں دیکھا

عالم وجد میں کھینچا تھا ابھی دامن یار
آ گیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا

عقل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
رو دیے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
معرکہ رات کا ہے شمع فروزاں دیکھا

جھوٹ ہے جھوٹ نہ جلسی تھے کبھی اور نہ شباب
سچ تو یہ ہے کہ عجب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرّہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں اودھر کو تو سبھی تھے لیکن
سب کے آگے تجھے اے عمر گریزاں دیکھا

تو کنارے پہ کھڑا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سرو چمن کس کو خراماں دیکھا

عکس عارض سے کسی کے یہ ہوا جلوہ صفا
آب آئینہ سے اُٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگارین کا وہ ٹھوکر لینا
فتنۂ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا نظم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد تگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ ——— ۱۳

رہ وادیٔ محنت میں پس و پیش پہ کب دل آیا
مثل آواز جرس کد میں و منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جھانک کے لیلیٰ کا جمال
بید مجنوں جو نظر صورت محمل آیا

کف افسوس سے اپنے ہی زمانے کو سرو
اس غم آباد میں میں مثل جلاجل آیا

نگہ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سر محفل آیا

برق سے تیز کہیں ہے روش عمر رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینۂ منزل آیا

مثل سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثل دانہ کے نہ جب تک کہ تہ گل آیا

اس پہ ہوا کہ جگہ حرص نہ پائے دل میں
کب نظر موج ہوا کا کوئی ساحل آیا

کٹ گئی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتۂ شمع نظر جادۂ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو
رحم جلاد کو کیسا دمِ بسمل آیا

جان دے کر بھی نہ افسردہ ہوئی اہلِ کرم
ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا سایہ
تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہے میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہے عجب
دوشِ احباب پہ میں گور کی منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھوں کے اٹھایا اے نظم
مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۲ (۱۱)

زندگی کیا ہے اک افسانہ کا دہرانا جانا
موت کہتے ہیں کسے زیست سے اکتا جانا

یاد ہے بزمِ مسرت میں ترا آجانا
جلوۂ حسن سے وہ شمع کا شرمانا جانا

منتظم قلزمِ ہستی میں ہے تارِ نفس
ڈوبتے کو ہے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نہ دیا خاطرِ نازک پہ ملال
مجھ سے دیکھا نہ گیا پھول کا کملا جانا

دل ہے دل اس کا تحمل ہے تحمل اس کا
کوہ کو جس نے پرِ کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بیخبری پر اپنی
کہ طلسماتِ دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے
ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکرِ خاک
طائرِ روح نے اک شب کا بسیرا جانا

ہیں دو ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا
میں نے ہر قطرہ کو جو لانگ دریا جانا

جنبشِ بادِ بہاری نے نکالی ہے یہ چھیڑ
برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظم
کس طرح آپ نے میخانہ کا رستہ جانا

۳۳ ——— ولہ ——— ۱۱

تن خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا
کوئی دانہ ہوا آہی نہ تہ گل ایسا

کون ہے اپنے ہواخواہوں کا قاتل ایسا
شکل تو چاند سی ہے آپکی اور دل ایسا

بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظیر جب سماع
اس قدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا

گور میں بھی نہیں طوفانِ حوادث سے مفر
موج تو ایسی بلا خیز ہے ساحل ایسا

میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سرانجام ہے کیا
مل رہے ہیں کف افسوس جلاجل ایسا

عفو فرمائے جو ناصح تو میں اتنا پوچھوں
اس نے دیکھا ہے کوئی حور شمائل ایسا

بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہے کریم
اک پرِ کاہ کی پرسش کرے عادل ایسا

تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلیٰ سمجھیں
دیکھ لے قیس اڑے پردۂ محمل ایسا

تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی
سبزہ آتے ہی گیا ارغ سے تل ایسا

ہاتھ انگڑائیاں لے لے کے بڑھاتے ہیں جو رند
کشتی مے کے لئے چاہیے ساحل ایسا

نظم نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۳۴ ——— فعلاتن فعلاتن فعلن ——— ۱۱

آگیا پھر رمضاں کیا ہوگا
ہائے اے پیر مغاں کیا ہوگا

باغ جنت میں سماں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو وہاں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مری نالوں سے
اور انداز فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے ساماں ہیں بڑے
اتنی مہلت ہے کہاں کیا ہوگا

دیکھ لو رنگ پریدہ کو مری
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگا ایک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مر کے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جسطرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یاد تو ذکر ہے یا نام تیرا
اور پھر ورد زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا حیدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۳۵ تفاعلن چار بار ۱۴

یہ ہوا آل حباب کا جو ہوا میں بھر کے اچھر گیا
کہ صدائے نقل موج کی یہ غرور کدھر گیا

مجھے جذب دل سے نہ لے جو بہک کے رکھا قدم کوئی
مجھے پر لگا دے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا
اثر اس کے عشوۂ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیاں کروں
مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا
تجھے اے خطیب چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں
کہ کتاب گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا
کسے تو سناتا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمن عقل و دیں
تری کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا
کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا
یہ وہ رات تھی کہ گذر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا
دلِ ناتواں کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا
غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نوید وصل سے مر گیا
مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجوم خوف و رجا رہا
وہ چمک کے برق رہ گئی وہ گرج کے ابر گذر گیا
مجھے بحرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر
نہیں کوئی چارہ کار اب مرے سر سے آب گذر گیا
مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزہ ملا ہے نہ پوچھئے
مے و انگبیں کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہان میں دوستی کبھی راستی میں ج مل گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ اودھر گیا
اگر آکے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فرو ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا
تجھے نظم وادی شوق میں عبث احتیاط ہی اسقدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

۳۶ مفعلات فاعلاتن دو بار ۱۱

کہیں قابل سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا
غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنوں سوار ہوتا
نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہی یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا
نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا
در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پر بس ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہ میں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجود بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں میں سزا کا یا جزا کا
مری ہست و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوز غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو چمک کے اخگر اخگر ابھی اک شرار ہوتا

وہ مآل زندگانی جسے کہتے ہیں غم عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دل ناکش میں قائل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۳۷ سفاعلن فعلاتن سفاعلن فعلات ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدو جاں ہوگا
ہوا چمن میں نہ گل چیں تو باغباں ہوگا

جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکسار وہاں
سپہر ناز کش گرد کارواں ہوگا

لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
کہ موج خوں سے خمیازہ کماں ہوگا

یہ آکے دیکھ کرامات میکدہ اے شیخ
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مر جائے تو یہ ڈر ہے | کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا
نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار | خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا
لگا کے تیغ بگڑیے نہ کیجیے انصاف | تڑپ سکے گا وہ کیوں کر جو ناتواں ہوگا
غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا | نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جاتا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جا وہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۸ ——— ۱۶

کہا جو تو نے دل ناصبور میں نے کیا | بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا
بغل سے دل کو نکالا کچل کے پھینکدیا | یہ ایک مفت کا جھگڑا تھا دور میں نے کیا
یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آؤں میں | ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا
تمہارا ذکر ہی کیا تم کو کون کہتا ہے | فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا
کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سے توڑ آنکھیں | اشارہ تجھ سے تھا اے برق طور میں نے کیا
جہاں کہیں ہوئی کثرت رہا میں آسے دور | جہاں ملی مجھے خلوت ظہور میں نے کیا
رہوں میں سر بہ گریباں یہ امر تھا دشوار | یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا
پھرا نہ موج حوادث نے لاکھ منہ پھیرا | چڑھا وکاٹ کے آخر عبور میں نے کیا
لگا نہ خاک سے دامن نہ خاک دامن سے | صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا
اب اپنے پاؤں سے پیری میں سر نہیں اٹھتا | سزا یہ اس کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی ملیں مجھ سے یہ نہیں امید
خفا ہیں اس لئے کیوں وصف حور میں نے کیا

یہ اڑ کے تخت سلیماں کی خاک کہتی ہے
مسیر اب سر بال طیور میں نے کیا

وہ میرے نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں
قیامت آئی اگر نفخ صور میں نے کیا

خدا نے منہ میں بال دی زبان میں لطف
اس ایک بات پہ کتنا غرور میں نے کیا

نگاہ شوق نے میری سکھا دی آرائش
شرہ کو شانہ کش زلف حور میں نے کیا

جو مجھ سے کہتے ہیں اے نظم حسن ظن لعباب
تو میں سمجھتا ہوں کچھ کر و زور میں نے کیا

۳۹ ——— ۱۶

ہزار آنکھ پڑی جب فراز بام آیا
ہمارے حسن پہ یزداں زیر دام آیا

یہ کیوں کہا تھا کہ میرا نہ نام آیا
گیا بھرے وہ ظالم تو وقت شام آیا

ہماری حصہ میں جھوٹا جو اس کا جام آیا
لب نگار سے بوسے کا یہ پیام آیا

ہے سب کو خانہ خرابی پہ شبہ تعمیر
ہوا غبار جو اونچا تو بن کے بام آیا

جو بھول کر بھی خوشی کا گذر ہوا دل میں
خیال موت کا لینے کو انتقام آیا

دیار عشق میں وہ صاحب نگیں ہوں میں
کہ یار کے لب لعلیں پہ میرا نام آیا

ترانہ سنج ہوئے عندلیب تیرے لئے
ہر ایک گل سے گلگوں کا لے کے جام آیا

کلیجہ پک گیا ناصح کو منہ لگانے سے
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کیا خیال خام آیا

عذاب جاں مجھے ہو جاتی تمام تنہائی
بھلے کو ساتھ بلاؤں کا اژدہام آیا

بڑا یہ حق محبت ادا کیا اس نے
کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا

زباں کا دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا
کوئی رفیق برے وقت میں کام آیا

گیا ہے لینے کو اس کے اگر یقیں ہے مجھے
پیام بر کے لئے موت کا پیام آیا

گمان رقیب کا ناصح پہ ہے بجا مجھ کو
کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا

کھلے جو بند قبا شب کو اس کے میں سمجھا
کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا

نگاہ ہو کے پریشاں پھری ہے کاکل سے
عجب یہ ہے کہ یہ رشتہ تھا بن کے دام آیا

خدا کا خوف کرو نظم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہ صیام آیا

۴۰ ——— ۱۶

بہ شہوت و غضب آلودہ دل مارا
بکعبہ طرح بنا ریختی کلیسا را

ز خویش رفتہ گرفتیم راہ صحرا را
سلام ما کہ رساند دیار سلمیٰ را

بہ بزم جلوہ برفتیم و ہمچو آئینہ
فروختیم بیک عشوہ دین و دنیا را

اگرچہ رخصت دیدار دادہ ما را
نگاہ قہر تو خوں می کند تماشا را

ہوائے ابر بفزود جوش صہبا را
شکست توبہ صدا کرد جام و مینا را

گذشت عمر و ندیدم کہ آسماں بکشود
بناخن مہ نو عقدہ ثریا را

قلیل فرصت عمر و کثیر حاصل عمر
حباب چشم کشود و بدید دریا را

غبار بام ربود ست و گرد بادستوں
عجب کہ خانہ برانداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک
شگافتم به عصا چون کلیم دریا را

حذر ز آه فلک تاز تو دل بیمار
که شکل دار بیاد آورد مسیحا را

هزار معنی مثبت ز نفی می خیزد
که نیستی پر پروازداد عنقا را

به جستجوی توام مثل دانه تسبیح
سپرده ام به این راه گام فرسا را

دلم گداخت چو مینا ز هول گرمی حشر
به بین حرارت اندیشهای فردا را

ستاده ام به شوق همچو نرگس زار
که آوریم بکف دامن سیحا را

سراغ میکده دل گرفته ام از شاد
خبر کنید حریفان باده پیما را

مخور فریب نظر تشنه لب بمیر ای نظم
سراب آئینه دار است حال دنیا را

۴۱ ——— ۱۰

من و نگاه تو با کیف می چه کار مرا
من و بهار تو با فصل دی چه کار مرا

بغیر صور سرافیل محشر است اینجا
فغان چو خیزدم از دل نی چه کار مرا

من و شناگری لذت جفای حبیب
به شکوه ستم پی به پی چه کار مرا

فریب عشوه دنیا نخورده ام مخورم
نیاز و غمزه بیجایش به چه کار مرا

ز بیخودی به گزشتم ز لامکان و مکان
به فکر هستی لاشئ و شئ چه کار مرا

بلند شد علم مهر و شبنم از جا شد
که با مسابقت ظل و فی چه کار مرا

بمن چو دوست شدی بس ضمان من بدست
چنین مگو که بکردار وی چه کار مرا

جز ائے ترک و فا ابن سعد می دانست | ولے نہ گفت کہ با ملک ری چہ کار مرا

ق

بہ ظل معدلت خسرو کن اے نظم | بہ عدل و سطوت کسری و کے چہ کار مرا

وظیفہ ام رسد از خوان نعمت عثمان خلد اللہ ملکہ

بوصف حاتم طائی و طے چہ کار مرا

۴۲ ـــــ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ـــــ ۱۲

دل راز عشق کا متحمل نہیں ملا | سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا

دریائے عشق پیر کے دو ہاتھ رہ گیا | موج ضعیف تھے مجھے ساحل نہیں ملا

کیا جانے لطف عشق بجز بحث بے مزہ | ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا

محروم ہم ہیں عید سے بھی او جفا شعار | اب بھی گلے سے خنجر قاتل نہیں ملا

جادہ ملا تھا رشتۂ تسبیح کی طرح | آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا

گردش سے ہم بھنور میں ہے جس طرح ہلال | کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا

کہنے پہ بت کے جبر گیا کیا تو کیا | کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا

ابرو کا اس کے دوسرا ابرو جواب ہے | ایسا کسی کو مد مقابل نہیں ملا

انساں کا دل تھا بارات کے واسطے | اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا

ہو کر نفس گسستہ کیا عرض شوق کیا | اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا

اک برق تھی کہ آگ لگائی نکل گئی | بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے نظم نیمجاں یہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

۴۳ ——— ۱۶

بادش بخیر جلوہ دلکش بہار کا
تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا

پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا
گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا

اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا
پہنچا فلک کو گور میں صدمہ فشار کا

لو بوالہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ
کیا توڑنا ہے سہل گریبان تار کا

ٹپکیگا خون برق کی لہروں سے باغ میں
ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا

ہم تو مجھ اسطرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے
کیا پوچھنا غبار سر رہ گزار کا

حاصل نہیں ہے زیست کا جز رقص بیخودی
لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا

ہے لوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا
ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا

دیوار باغ نے کوئی سونا نہ تک
دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا

ہستی کا قافلہ ہے عدم کی طرف رواں
دور سیہ ایک تیز ہے غبار کا

مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
بازار دہر میں ہے چلن اعتبار کا

ہر دم ہے دم شماری پیہم سے دل کو کام
ٹھکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا

ناداں اپنے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم
شکوہ زبان پہ ہے ستم روزگار کا

اس زلف مشکبو کی سیاہی کہیں ملے
کالا کروں گا منہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیا ہے جب سے ترے آستاں پہ
ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا

شاہوں کو ناز تخت مرصّع پہ ہے تو ہو
مالک ہوں میں بھی کلک جواہر نگار کا

۴۴ ——— ۲۳

سینہ میں دل ہو دل میں کچھ ارمان ہو تو کیا
آنکھوں میں اشک اشک میں طوفان ہو تو کیا

سر ہی یہاں نہیں ہے جو سامان ہو تو کیا
دامان ہو تو کیا جو گریباں نہ ہو تو کیا

دو دن کے واسطے سر و سامان ہو تو کیا
سب کچھ سہی جو دل ہی میں ارمان ہو تو کیا

ہیکل پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ
بدعہد کے گلے میں جو قرآن نہ ہو تو کیا

کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے
ظالم متاع درد بھی ارزاں نہ ہو تو کیا

لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی
دولت ہو اور عادت احسان نہ ہو تو کیا

ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور
اس طرح ناز سے جو خرامان نہ ہو تو کیا

تالو سے جب زباں نہیں لگتی جناب کی
ناصح بھلا دماغ پریشاں نہ ہو تو کیا

راضی ہوں فضلِ خون نہ دے بیچ کیجیے
تسکین دل جو عیسیٰ دوراں نہ ہو تو کیا

سالک کو حق کے ڈھونڈ دی میں کچھ فرا
اس راستہ میں بھول بھلیاں[1] نہ ہو تو کیا

دن میری زندگی کے گذر جائیں صبح تک
اتنا بھی طول اے شب ہجراں نہ ہو تو کیا

رکھا نہ معصیت نے کہیں کا ہزار حیف
بندہ ہوا و تابع فرماں نہ ہو تو کیا

مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال
معلوم اس کو حال پریشاں نہ ہو تو کیا

[1] بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مونث ہے ۱۲

مانا کہ تو نے جوگ لیا درد عشق میں
اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہو تو کیا

یہ تو بتا کہ چاک گریباں سے فائدہ
جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہو تو کیا

مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہے چمک
عارض پہ اس کے وصل میں غلطاں نہو تو کیا

اچھا سہی کہ وہ محشر خرام ہے
تلووں کے نیچے دیدۂ حیراں نہو تو کیا

یوں خاک نعش پر لوٹے کہ تم تو کیا حصول
قاتل کا اپنے ہاتھ میں دامان نہو تو کیا

جھک جھک کے ڈھونڈتا ہے عبث اس گلی میں تو
اس خاک میں ترا دل نالاں نہو تو کیا

جاتا ہے اس کے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے
گر تیرے روشناسوں میں دربان نہو تو کیا

گر اذن عام غیر کو ہے تو ہوا کرے
تیرا گذر وہاں کسی عنواں نہ ہو تو کیا

کہتے ہو جو پڑیگی مصیبت اٹھائیں گے
لیکن وہ ظلم کرکے پشیماں نہو تو کیا

سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل
مرنا بھی مرے جان جو آساں نہو تو کیا

۴۵ ——— ۱۱

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا
یارب میں رو سیاہ سہی تو کریم تھا

کوٹھے پہ آکے نعش کا جانا تو دیکھ لے
لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا

واعظ خدا کے واسطے اس بت کو تو دیکھ
پیتے اگر نہ مے تو گناہ عظیم تھا

کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی
کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا

نازک ہے اتنا کا دماغ فرقتی
ہم کو تو سر اٹھانا ہی بار عظیم تھا

دنیا کی نعمتوں میں برابر کا زہر ہے
اصلاح تو یہ دیکھے آخر حکیم تھا

ایک ہم تھے اور پیش اعمال قبر میں
آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا

دنیا سے دل اٹھا کے عجب بے دلی کی
اک دوش پر جنازۂ امید و بیم تھا

ساتوں فلک بار امانت اٹھا سکے
ہم نے اٹھا لیا وہ جو بار عظیم تھا

اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی
تھا خاک بھی تو خاک رہ مستقیم تھا

اے نظم خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن سے دشت ایک خط مستقیم تھا

۴۶ ——— ۱۵

میں پا کے اس سے عفو کا پروانہ چھٹ گیا
اہل خرد دھرے گئے دیوانہ چھٹ گیا

کیا حال پر ملال شب غم بیاں کروں
ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ چھٹ گیا

آئی تھی اب مزہ یہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

کس راستہ سے ناقۂ لیلیٰ کو لے چلا
اے ساربان قیس کا ویرانہ چھٹ گیا

مستی میں ایک کی نہ رہی ایک کو خبر
شیشہ سے بزم عیش میں پیمانہ چھٹ گیا

کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئی تھے
اشکوں سے رنگ نرگس مستانہ چھٹ گیا

کو اضطراب شوق بھی نکلا حریف نم
چٹکی میں آ کے شمع کی پروانہ چھٹ گیا

قابو سے نفس بد کو نکلنے نہ دے کبھی
پھر شیر ہی جو یہ سگ دیوانہ چھٹ گیا

دیکھا فریب حیرت بزم وصال کا
دست مژہ سے مجھ صد دانہ چھٹ گیا

دی آ کے کیا نسیم نے حیرت فزا خبر
ہر شاخ گل کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

تھا وصل روح و تن نفس واپسیں تلک
دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا

احسان یہ کیا عرق انفعال نے
دامن سے داغ گریۂ متاں چھٹ گیا

واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی
ہونٹوں تک آ کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا
اس کو بھی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

رکھلے کیا وطن میں اب اے نظم خستہ جاں
ہو اس لئے اداس کہ ویرانہ چھٹ گیا

۴۷ ـــــ مفعول فاعلاتن دو بار ـــــ ۱۴

پرسش جو ہوگی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خون میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پر افشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دیئے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تار داماں ہے طوق اک گریباں
زور جنوں نہ کم ہو جلاد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہیگی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوبؑ قطع کردیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا

دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی ہے ظالم پھر یاد کیا کرے گا

اے خطِ بیاضِ عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریرِ حسن کی کچھ روداد کیا کرے گا

کنجِ قفس سے اک دن ہوگی رہائی اپنی
مرجائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا

مثلِ سپند دل ہے بیتاب سوزِ غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا

اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریشِ سفید اپنی برباد کیا کرے گا

ظلم و ستم سے بھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچا
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا

از بسکہ بے ہنر ہوں میں ننگِ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا

اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل

۴۸ ——— ۲۰

واعظ نے در کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے ابھی جلوہ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٰ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیت دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا
ویراں اسے دیکھا بھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل تالب خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریف خم چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکیگی یہ جوانی کی امنگیں
رو کو ابھی تو سن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانی خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا وہی منزل پہ ملی جس کو رہ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اسے آساں ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جب تک کہ میں اٹھوں
کوسوں تجھے اے عمر گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاک سلاطین سلف کی
گردوں سے کبھی دست و گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلٹ نہ کیا ہے وہ پر کاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

وادی حقیقت میں پھرا جو وہی جانے
ایسا بھی جنوں خیز بیاباں نہیں دیکھا

ہے گلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کیلئے رشک کی جا ہے سفر برق
جز ابر سیہ و دشت نہیں دیکھا

کیا حال گلستاں کا ہے جھونکے خزاں کے
طاؤس کو اس طرح پر افشاں نہیں دیکھا

ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی
پھرتے ہوئے یوں حیرت سلیماں نہیں دیکھا

وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی
کوچہ کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی برزدہ داماں نہیں دیکھا

۴۹ ——— ۲

سب دل کا بخار آنسوؤں کے تار نے کھینچا
آندھی کو رگ ابر گہربار نے کھینچا

ہر اشک کے سیلاب میں جھنکار کی آواز
پرکالہ دل گریہ سر شار نے کھینچا

نقشہ نہ کھنچا خواب پریدہ کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدہ بیدار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسوں کی تمنا
اس شوق میں چلّہ لب سوفار نے کھینچا

شوق القمر انگلی کے اشارے سے دکھایا
قشقہ جو بت آئینہ رخسار نے کھینچا

کن کن تمرونکو قد موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موسم کہسار نے کھینچا

بگڑے کبھی چکی ہی سے گیسو شب عشرت
نالہ کبھی یا زیب کی جھنکار نے کھینچا

چھپ چھپ کے بھی روتا گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں غم دلدار نے کھینچا

میرا دل پر داغ ہے افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

مجنوں کو مری دشت نوردی پہ حسد ہے
کانٹا جو چبھا پاؤں میں خمدار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے
سورج کی طنابوں کو دل زار نے کھینچا

چھالوں نے مرے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا
دامن کو مرے دشت کے ہر خار نے کھینچا

پھر تم مجھے کہنا نہ کبھی مرشد منصور
نعرہ نہ انا الحق کا اگر دار نے کھینچا

چو رنگ لگانے کا جو ابرو کو ہوا شوق
آہوئے حرم طرۂ طرار نے کھینچا

لی ابر بہاری نے پر زاغ کی رنگت
نقشہ دم طاؤس کا گلزار نے کھینچا

گریہ کا تعلق مری پلکوں سے عجب ہے
سیلاب کا دامن نہ کبھی خار نے کھینچا

خورشید سحر گاہ کا جیتک نہ کیا خون
مشعلہ بھی نہ ہند وی شب تار نے کھینچا

لہرانے لگا خون جگر نوک مژہ پر
گلزار کو خار سر دیوار نے کھینچا

تو راہ زن سعی تھا او بلہ... پا
اچھا ہوا سولی پہ تجھے دار نے کھینچا

دو مے گلرنگ ہا شب کو سہل تک
آغوش میں بیہوش کو ہشیار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

۵۰

باور سخن غیر کو فریاد نہ کرنا
پچھتاؤ گے ایسا کہیں اوستاد نہ کرنا

صدموں کا گلا اے دل ناشاد نہ کرنا
جلاد کو چاہا ہے تو فریاد نہ کرنا

گیسوئے رہا تم دل ناشاد نہ کرنا
اب دام میں لائے ہو تو آزاد نہ کرنا

یہ تو نہیں کہتا میں کہ سیاد نہ کرنا
ہاں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرنا

بھولا نہیں فرقت کا زمانہ مجھے اب تک
وہ میرا تڑپنا وہ ترا یاد نہ کرنا

وہ خاک اڑانے کو تو آئے سر دفن
اور میں یہ کہوں خاک کو برباد نہ کرنا

چٹکی ہے کلی کوئی نہ کوئی پھوٹی
نالہ ابھی اے مرغ چمن زاد نہ کرنا

ہم سے وہ اس اقرار پہ کرتے ہیں ملاقات
ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

یا دیر پہنچنے میں مزہ آتا ہے تجھ کو
تو قتل میں جلدی کہیں جلاد نہ کرنا

سمجھو یہی جادہ ہے بزرگان سلف کا
دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہے تیرے ہاتھ
لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

او وعدہ خلاف اپنے تغافل کی قسم ہے
تا عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہے دیوانہ دلی میں
ہاں ترک کبھی عشق پہ بنیاد نہ کرنا

۵۱ ——— فعلاتن مفاعلن فعلات ——— ۱۶

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا
اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

اُف نہ کی آزما کے دیکھ لیا
تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے
کیوں مزا تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تھے آنکھ سے نہ جسے
اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

پھول سے ہیں سبک قدم اس کے
میں نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا
کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

مجھ پر احسان ہو نزاکت کا
تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا ادھر دلِ زار
تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا

دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں
ہاتھ بیجا بڑھا کے دیکھ لیا

مر گیا میں سمجھ کے سچ اس کو
کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا

ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں
ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت
ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا

کچھ کرو اپنی ہی سی کرتا ہے
دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا

شرع میں بھی ملا جو نامہ یا۔
اٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا

دل کی چوری بھی کھل گئی اب پر
آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغ کا جواب اے نظم
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

۵۲ ——— مشاعرہ سروجنی نائڈو ——— ۶

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا
فکر کا ہیکلی اب - ہوا نہ ہوا

خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا
تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا

دل تو دیتا ہے تو مجھے یارب
اور اگر در د آشنا نہ ہوا

حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی
سات پردے تھے سامنا نہ ہوا

ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے
دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

لہ زینہ ابھی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

تو نے روزِ الست حیف اے نظم
وعدہ تو کر لیا وفا نہ ہوا

ولہ

۵۲

دم گیا شوقِ جستجو نہ گیا
عارضوں کی صفا سے شرما کر
کہیں ہوتے ہیں سنگ دل ایسے
لے اوڑا مرغِ نامہ بر مکتوب
خاک میری رہی صبا کے ساتھ
گھونٹ ڈالا گا گریباں نے
خلد میں خاک پھر ملے گا لطف
تھا جو مجھ کو لحاظ قاتل کا
پی کے مے شیخ ہو گیا بے خود
ولولے وہ رہے نہ جوشِ شباب
تا کمر پہنچ کے طرۂ سنبل
میری آغوش کی سی شکل جو تھی
کسی محفل میں وہ بہارِ حسن
مر رہا آ کے میں ترے در پر

۱۶

دل گیا داغ آرزو نہ گیا
آئینہ اس کے روبرو نہ گیا
رحم دل میں تمہارے چھو نہ گیا
دل بیتاب ساتھ تو نہ گیا
مر کے بھی شوقِ جستجو نہ گیا
دستِ کوتاہ تا گلو نہ گیا
ساتھ جب ساغر و سبو نہ گیا
اُڑ کے دامن تلک لہو نہ گیا
پھر بھی تقویٰ رہا وضو نہ گیا
ہائے ایک جوشِ آرزو نہ گیا
مثلِ گیسوئے مشک و بو نہ گیا
شرم سے وہ کنار جو نہ گیا
بے طلسماتِ رنگ و بو نہ گیا
ٹھوکریں کھانے کو بکو نہ گیا

اڑ رہا ہوں غبار ہو ہو کر | زورِ پرواز جستجو نہ گیا

نظم اس سال بھی زیارت کو
جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۹۴ ۱۲

خیال و خواب سا گذرا نظر مثلِ سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہدِ شباب آیا

کہاں اے نظم لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا
جہاں سو بار طوفاں موج خیز اضطراب آیا

شبِ غم میں ستاروں کے لئے روزِ حساب آیا
مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا

سحابِ تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا
اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا

عبث کی گردشِ افلاک نے گہوارہ جنبانی
نہ دل ٹھہرا نہ غم بھولا نہ موت آئی نہ خواب آیا

نکل اے جانِ مضطر میں بھی اب ہوں ہمنشیں تیرا
ٹھہر اے عمرِ رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا

فلک اندر فلک ہے کائنات اس بزمِ عالم کی

مے عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا
جواہر ریز ہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشہ شبنم میں یاقوت مذاب آیا
قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہکر
میں اب جھک جھک کے چلتا ہونکہ سن لوں کیا جواب آیا
شب غم میں پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا
رہے قسمت نہ خنجر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا
نہ جا میخانہ میں اے نظم ہم سمجھے نہ کہتے تھے
وہاں سے ہو کے مدہوش و سیہ مست و خراب آیا

حرف (ب)

۵۵

اٹھا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے کب
پاؤنگا قافلہ کا پتہ نقش پا سے کب
تنہا ہی احتیاج کا داغ التجا سے کب
او ہزہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
سختی کو جھیل جا تو سعادت شعار ہے
خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب
ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا
سر کا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم
پانی سفید برسے گا کالی گھٹا سے کب

فریاد کس سے کیجیے گردوں کی دور میں
نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب

تو بھی تو ہمرکاب تھا اے شوق کوئی یار
پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب

موتی سی آبرو کو ہو کیا حرص میں فروغ
اٹھتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب

ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی
یہ ربط کاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب

پہنچی ہے ٹھیک وقت پہ میخانہ تک گھٹا
کیا جانیے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب

دوزخ ہی میں گرائیگا لیجائے نفس شوم
یہ پوچھتا ہے راہ کسی رہنما سے کب

کیا جانیے کب طلسم خودی سے نجات ہو
نکلے یہ عکس آئینہ ماسوا سے کب

ہم کو بقائے نام کی پھر کیوں ہو سن نہ ہو
دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب

جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ
توبہ وہ کرنے بیٹھی ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہے رنگ لعل سے سرخی حنا سے کب

۶۵ ولہ ۹

کوئی مے دے یا نہ دے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ

غافل و ہشیار و تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں رہے میری دعا منت کشِ بال ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ

ہے تعجب خضر کو، اور آبِ حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزینِ دامنِ صحرا ہیں آپ

منزلِ طول امل در پیش اور مہلت ہے کم
راہ کس سے پوچھیے حیرت میں نقشِ پا ہیں آپ

حق سے طالب دید کے ہوں ہم بصیرا ہیں آپ
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ

گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبلِ شیدا ہیں آپ

حرص سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلانیکا میں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ

ہم سے اے اہلِ تنعم منہ چھپانا چاہیے
دم بھرا کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

۵۷

۱۴

سلہ دم سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

سخن میں ہے گہر آبدار کی صورت
قلم میں ہے رگِ ابرِ بہار کی صورت

عدم کا خواب بھی نرگس کو خوابِ نوشیں تھا
کہ آنکھ کھول کے دیکھی بہار کی صورت

طواف کیجیے اس آستاں کا جس در سے
ہوئی فلک کے لئے روزگار کی صورت

قسم یہ دے کے چلی ہو کہ بیقرار نہ ہو
بتاتے جائیے دل کے قرار کی صورت

ہلالِ عید کو میں دشنۂ قضا سمجھا
کہ چاند دیکھ کے دیکھی خمِ یار کی صورت

ترے فراق میں لیں میں نے کروٹیں تا صبح
نہ بن پڑی کوئی لیکن قرار کی صورت

خدا دکھائے نہ دشمن کو بھی وہ کالی رات
بہت بری تھی شبِ انتظار کی صورت

خدا کا فضل ہے ملکِ دکن کے شاملِ حال
برس پڑے کہیں ابرِ بہار کی صورت

کبھی فراق میں تارے گنے کبھی گھڑیاں
نظر میں پھر گئی روز شمار کی صورت

بس انتظار جو کھینچا تو میری آنکھوں میں
کھچی ہوئی ہے تری انتظار کی صورت

ہر ایک برگِ خزاں دیدہ ہے وہ آئینہ
کہ جس میں دیکھ رہا ہوں بہار کی صورت

نہاں ہے فیض کا چشمہ بھی خارِ رخساروں میں
کہ ابر کا ہے ہیولا غبار کی صورت

شگفتہ ہے گلِ تر کی طرح سے شعلۂ شمع
حریرِ شعلہ سے ظاہر ہے خار کی صورت

ہمیں کو دخلِ سفید و سیہ میں تھا اے نظم
رہی نہ ہائے وہ لیل و نہار کی صورت

۵۰

کرتا ہے ظلم و جور یہ چرخِ کہن بہت
مل مل گئے ہیں خاک میں گل پیرہن بہت

اک مشت استخواں پہ گناہوں کا بوجھ ہے
تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت

نقشہ چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
اترا رہے ہیں پھول پہن کر کفن بہت

ہم کو بھی مل رہیگی کسی سے سخن کی داد
جوہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

۵۹ ولہ ۳۷

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور ما و من بہ بزم ما سوا افتادہ است

آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد زپا افتادہ است

کوچہ زلف و شب دیجور درہ تاریک و تار
دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است

شکوہا دارم ز انداز گراں جانی خویش
ہست چوں سنگے کہ در راہ وفا افتادہ است

کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است

سایہ بر خورشید افتادست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است

انس بگرفتم زبس با خانہ ویرانی خویش

سبزهٔ بیگانه با من آشنا افتاده است
شرمسارم عذر بدتر از گناه آورده ام

پرده بر روی من از دست دعا افتاده است
شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک
شیشهٔ صبر من از بام دعا افتاده است

من همه تن گوش باشم بر صدای الرحیل
دود و چشم گرد آواز در افتاده است
ماندگی پای من سدی که بر من بسته بود
بر سرم از صدمهٔ شور درا افتاده است

برق را گفتم مجوز نیستی راه گریز
از میان جست و در آغوش فنا افتاده است
چون الف آهی کشم و زهستی خود بگذریم
در کمند وحدتم صید فنا افتاده است

گردش نه آسمان و یک دل نالان من
دانه هست و بدست آسیا افتاده است
انقلاب چرخ نتواند مرا از جا برد
من دلی دارم که قطب آسیا افتاده است

باز آمد تشنہ کام از بسکہ اسکندر بدید
جیفہ اندر چشمۂ آب بقا افتادہ است

نسبتے دارد حدوثِ دہر با لوحِ قدم
ہمچوں آں نقشے کہ بر آبِ بقا افتادہ است

ہر قدر نزدیک تر آید بگردد دور . . تر
سالکِ راہش برہ چوں نقشِ پا افتادہ است

سرنگوں گشتم ز پیری من کجا و فکرِ شعر
طرفہ مضموں بلندے پیشِ پا افتادہ است

میدہد جامِ فنا بر کف صلا ضحاکِ دہر
دورِ جم آخر شد و نوبت بما افتادہ است

نقدِ فرصت را بیغمائی برد نفسِ حریص
حیف ازیں دزدے کہ در کالا بما افتادہ است

ناروائی ہست آئینِ دکانِ اہلِ فن
نقدِ معنی چوں متاعِ ناروا افتادہ است

گہکشاں با کج روی تا آسمانہا سر کشید
بر زمیں چوں نظمِ خطِ استوا افتادہ است

بسکه جوش اضطراب شوق برق خرمن است
تا تو دریابی مرا من نیستم خاک من است
از غم عشقش بیاسایم نه این کار من است
خوش بیفروزیم آتش تا هوا در دامن است
تا مرا تاب و تواں و هوش خرمن خرمن است
جمله وقف انتظار و شوق برق ایمن است
از کواکب بر سر ما ریخت گرد فتنها
چرخ گرداں آسیا ست و هم پروین است
وهم هستی بسکه چشمت را غبار آلود . . کرد
تا تو می بینی مرا من نیستم گرد من است
موسیا و از فغاں گفتگوے یار را
در صدائے لن ترانی موج برق ایمن است
کاروان اشک خون بر ره گذر گذشت دوش
نقش پائش از سر موئے مژه تا دامن است
گفت گل را بگفتم رخ همی پوشی چرا
گفت مجنونم مرا خوں و فا بر گردن است
از هجوم ظلمت اندوه و غم مضطر مباش

بعد شب صبح ست و بعد از صبح روز روشن شبست
ما سراغ حق همی گیریم از نامحرماں
کاندریں وادی چراغ راه چشم رهزن ست
درس عبرت را ازیں پیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغاں و شیون ست
میکشد در ره ترا ایں سعی بیجا اے سپند
نردبان دود دل کوته ز بام شیون ست
طے کند صد ساله ره از برگ گل تا آفتاب
بهر شبنم ایں کرامتها ز قلب روشن ست
حاصل عمر خود از بهر تماشا سوختی
نظم ایں جوش طرب رقص شرار خرمن ست

وله

عشق از سوز دل من طرح آتش خانه ریخت
اخگر از آتش گرفت و در دل پروانه ریخت
کشته آں ترک ستم گر سر ناز و غرور
کافرم پنداشت و خونم چه بیباکانه ریخت
چاره بے خوابیم ناید ز تو اے قصه خواں

درد و چشم صد نمک داں شور ایں افسانہ ریخت
گرد چوں خورشید تیغ خونچکانش در نیام
چرخ از شب دام بکشاد و ز اختر دانہ ریخت

ولہ

۶۱

ہوس بر غم خرد و مدعائے دیگر داشت
صوابدید دگر بود رائے دیگر داشت

اگرچہ خضر رفیق طریق بود ولے
سلوک منزل دل رہنمائے دیگر داشت

نہ گشتہ ایم مکدر ز صد مرئ نفسے
کہ آب آئینہ ما صفائے دیگر داشت

جہانست صفحۂ اعمال مردانستم
کہ لغزش قدمم نقش پائے دیگر داشت

صعود کردم تا لامکان و برگشتم
کہ گوشۂ دل روشن فضائے دیگر داشت

دلم اگرچہ بخود ہر چہ کرد بد کردست
ولے خیال نکوئی بجائے دیگر داشت

مگو کہ نالہ کشیدیم و بر نخواست صدائے
شکست گنبد مینا صدائے دیگر داشت

ز کنج صومعہ ایں جا رسیدہ بر خوردم
کہ کنج میکدہ آب و ہوائے دیگر داشت

بجرم عشق تو کشتی مرا و شاد شدم
چرا کہ کشتہ تو خونبہائے دیگر داشت

مپرس حال ز خود رفتہ براہ فنا
کہ جادۂ دگر و نقش پائے دیگر داشت

بہ زعم من ہمہ بودیم طالب رہ دوست
براہ فتنہ فتادن بنائے دیگر داشت

بہ بزم عیش منہ دل بہ شکوہائے فراق
حکایت شب غم ماجرائے دیگر داشت

بوہم رشک برفتیم و باز گردیدیم
کہ راہ کوچہ او نقش پائے دیگر داشت

۱۶

متاع هوش بباد فنا بداد و گذشت
مگر پریدن رنگم هوائے دیگر داشت

به پند ناصح ناداں که گوش ننهادم
کلام او سخن نارواے دیگر داشت

فریب نغمهٔ بلبل نخورده ام اے نظم
که خامه ام نفس مشک سائے دیگر داشت

۶۲ ۱۲

زکنه واجب دادار هیچ نتوان گفت
هر آنچه گفت کسی تا بحد امکان گفت

غم تو در دل من آنچه نگفت پنهان گفت
میان جمع ندانم چه چشم گریان گفت

هر آنچه گفت گل از خواب خود پریشان گفت
ز بزم گلکده پنهان برفت و خندان گفت

به شاهراه طلب ذوق سعی را نازم
که مشکلے که برد عرض کردم آسان گفت

ورود لشکر و وادی نمل و مور ضعیف
ز هیبتش نتوان هیچ با سلیمان گفت

اماں ز باد فنا نیست در حصار سپهر
چراغ مهر شنیدی چه زیر دامان گفت

چه خواست تیر نگاهش ز من نه دانستم
که هر چه گفت مرا از زبان پیکان گفت

زهے مروت ابر و زهر استغاثش
صلا بخواں کرم بر کشیده دامان گفت

ز عشق ضبط فغاں طرفه لذتے دارد
حکایتے ست که نتوان شنید و نتوان گفت

غزل اگرچه بگلبانگ بلبلے ماند
هزار نکته در و شاعر سخندان گفت

حکایتے ز تماشائے بزم وصل دید
که شمع کشته بگفت از زبان مژگان گفت

کسے چه گوش نهد بر بیان نظم بحشر
که خواب مستی خود گفته و پریشان گفت

۶۳ ——— وله ——— ۱۱

کامگار است هر که ناکام ست — زانکه گیتی طلسم اوهام ست
بدگوهر که را که بدنام ست — نام او خود بجائے دشنام ست
فال باده کشی مزن واعظ — خط پیمانه حلقه دام ست
دین و دنیا بهم نخواهد رفت — طمعے هست و سر بسر خام ست
انفعال گناه و حسرت دید — چشم بر پا و جلوه بر بام ست
گرد بادیم و راه کوچه دوست — نیست ما طواف و احرام ست
آستانش کجا و سجده ... ما — بوسه عاشقان به پیغام ست
اصل گیتی ست جوش باده عشق — کهکشان حلقه خط جام ست
جست از جا سپند و رمزے گفت — کز عدم تا وجود یک گام ست
بنده آن کسم که در عالم — نیک کردار و نیک فرجام ست

نظم دانسته ام به عمر سپهر
صبح آغاز و شام انجام ست

۶۴ ——— قطعه ——— ۵

مرکب ماست کوکب سیار — از مسیرش سنین و اعوام ست
او درین راه خویش غلطنده — شام تا صبح صبح تا شام ست
تا هلال از هلال یک منزل — تا صباح از صباح یک گام ست

که قریب است و که بعید از شمس — قرب و بعدش فصول ایام ست
هر چه بینیم ما همی بینیم — که زمین فرش و آسمان بام ست

۶۵ — شاه صدر اعظم بهادر — ۹

دل همه زخم و دو زلفش شکن اندر شکن است — در خم هر شکنش نافهٔ مشک ختن ست
نوبهارست و پری خانه به مینا دارم — جنبش بال پری موج شراب کهن ست
رفت عمر و ز چمن دور و اسیر قفسم — در دلم نقش هوا خواهی سرو و سمن ست
خواستم نافه ز زلفش بکشایم در باغ — گفت هشیار که غمازِ نسیم چمن ست
بسکه بگریخته از صحبت ابنای زمان — بر سرم گرد غریب الوطنی در وطن ست
ابر بر کوهی عمر تو می گرید زار — برق ازین ره که تو غافل گذری خنده زن ست
قمرنها بود زمین غرق بخون ناحق — شاهد راز درون لالهٔ خونین کفن ست
غزل شاد که سلک گهرش می گویند — شهر حسن قبولش ز دکن تا عدن ست
برتری از دگران اهل سخن راست بجا — جوهر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ — دله — ۷

آورد عرض بار امانت چنان شکست — پشت سپهر تا کمر کهکشان شکست
موجی چو سیل سر زده از قلزم شهود — در وادی سپهر گران تا گران شکست
سوز فراق و گریهٔ شبهای تار حیف — بنیان شمع از مژهٔ ما استخوان شکست
پیر مغان براه کرم جرعهٔ بداد — کز دیدهٔ خمار هستی من جاودان شکست

خم گشت پشت مرد و بدل آرزو بماند
ترکش هنوز ناشده خالی کمان شکست

این قید و بند بود پئے مرغ روح من
تا من رها شدم قفس استخوان شکست

مرغے به پیش ابرهه رفت و صدا نکرد
کز سنگ ریزه گردن پیل دمان شکست

۶۷ — ۱۹

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح
لوٹ جاؤنگا میں داماں کیطرح

پاؤں پھیلائے ہیں داماں کیطرح
ہاتھ کھینچا ہے گریباں کیطرح

چل گیا مجھ پہ یہ دوھرا خنجر
پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کیطرح

تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم
توڑ ڈالا جسے پیماں کیطرح

سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے
تیغ آئی تیرے احساں کیطرح

میرے غماز کا ہے منہ کالا
میرے ہی نامۂ عصیاں کیطرح

کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم
ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ قرآں کیطرح

اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤں
میں ہوا پر ہوں سلیماں کیطرح

پر کدورت ہے دل زار ایسا
خاک اوڑتی ہے بیاباں کیطرح

مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے
زرفشاں جلوۂ عثمان رضی اللہ عنہ کیطرح

نظم کے پاس تھا کچھ دل کے سوا
کھو دیا اس کو بھی ایماں کیطرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کیطرح
زمیں نکل گئی قدموں سے آسماں کیطرح

الٰہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے
کہ ڈھانک لے در میخانہ سائباں کیطرح

دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم
جو اس زمیں کیطرح ہے نہ آسماں کیطرح

کوئی نشاں نہ ملا کسطرف گئے احباب
بھٹکتے رہ گئے ہم گرد کارواں کیطرح

نزول رحمت باری ہے آج کثرت سے
کہ ابر کشتی مے پر ہے بادباں کیطرح

دل و جگر کبھی کاہیکو یوں تڑپتے تھے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کیطرح

جہاں میں صاحب ہمت کی یہ نشانی ہے
عروج پائے جھکے پیر آسماں کیطرح

سوا نمود کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں
یہ حلقہ بیچ سے خالی ہے کہکشاں کیطرح

۶۸ — ۱۰

اس مہینہ بھر کہاں تھا ساقیا اچھی طرح
آ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح

انگلیاں کانوں میں رکھکر اے مسافر سن ذرا
آ رہی ہے صاف آواز درا اچھی طرح

چشم موسیٰ لا سکی اک آدھ جلوہ کی نہ تاب
چشم دل سے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح

فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے
کیا کہوں بڑھتا نہیں دست دعا اچھی طرح

اہل صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض
اچھی صورت چاہئے اچھی ادا اچھی طرح

شاہدان لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ
سال بھر کے بعد آئی اے صبا اچھی طرح

سیکھ لیگی بل کی لینا تا کمر آنے تو دو
بل ابھی کرتی نہیں زلف دوتا اچھی طرح

شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے
آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

لیتے ہیں اہل جنوں کیا کیا تصور کے مزے — آنکھ سے پریوں کو دیکھا بارہا اچھی طرح

دے رہی ہے اسکی خاموشی صدائے دوبدش
یہ نہیں کہتا کہ نظم مبتلا اچھی طرح

حرف خ

۶۹ — ۱۲

سمجھا ہوں عیش و طیش جہان خراب تلخ — ہے جام و آرزوں میں فلک کے شراب تلخ
دنیا کو آنکھ بھر کے نہ تھا دیکھنا تجھے — ہستی کا ایک جام بھی ہے اے جناب تلخ
پیری سے بڑھکے عہد کوئی بے مزہ نہیں — شیریں تھا گر زمانہ طفلی شباب تلخ
آیا تھا باغ دہر میں کیا جانتا تھا میں — کر دے گا زندگی دل خانہ خراب تلخ
پیتا ہوں ڈگڈگا کے تو بڑھتی ہے تشنگی — پیاسا کنار بحر ہوں میں اور آب تلخ
بے منت حریف جو حاصل نہ ہو سکے — ہے شیر ناب بے مزہ اور شہد ناب تلخ
سمجھو نہیں کسطرح سے کہ شیریں ہیں لب تیرے — میں نے تو ہر سوال کا پایا جواب تلخ
ناصح فسانہ کہنے میں اگلا ہے تو نے زہر — سن سن کے ہو گیا میرے آنکھوں میں خواب تلخ
اک دل جمع ہے اور داس تو محفل اور داس ہے — جام شراب تلخ ہے شور رباب تلخ
سمجھا ہوں جو کہ جنت و دوزخ سے ہے مراد — یعنے کہ ہے کرم تیرا شیریں عتاب تلخ
پوچھو زبان شمع سے کیونکر ملا فروغ — ہوتی ہے جانگدازی راہ صواب تلخ
اے نظم جانتا ہوں فریب جہاں کو میں — پیاسے کے ہے مذاق میں موج سراب تلخ

۷۰ ——— ۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام مشک و بو صیاد
ہوئی ہے دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بوئے گل سے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
نہ باغباں ہے مخالف نہ ہے عدو صیاد

چمن میں خوف اسیری کا ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

جو گل فروش ادا ہے تو بوسہ ہے گلچیں
وہ آج صید ہیں اور جوش آرزو صیاد

کیا ہے لطف اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مئے گلرنگ کا سبو صیاد

لپٹ کے سرو سے قمری یہی تو کہتی ہے
مری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں رگیں دست سے جا بجا نالے
گلوئے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں یاد چمن کی یہ گل کھلاتی ہے
بنا ہے لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں نہ کر مرے گھٹ گھٹ کے میں تمام ہوا
گلے کی ہو گئی پھانسی رگ گلو صیاد

ہمیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے اے نظم
کرے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۷۱ ——— ۱۰

آئینہ از پرتو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشتر آں کس کو رہا از بند ما و من شود

عشوہ او تیغ چوں بر من کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشائم و جوشن شود

اے کہ شمع مدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوز نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالہ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچہ گیسوے او
جادہ بر خود پیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایہ صد گرمی باشد دل صد آرزو
رہگزارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندہ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در ہر قدم برخیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگاں تو

بشکنم نشتر بدل گر ہل شیون شود

۷۲ ۱۲

جوش سرشک تا سر مژگان نمی رسد
وازخون دیده گل بگریبان نمی رسد

بالاترست جلوه او از فراز عرش
آنجا نگاه موسی عمران نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در رهِ طلب
شبنم به اوج نیر تابان نمی رسد

ابر سیاه در نظر جذب شوق ماست
این گرد سرمه تا به صفاهان نمی رسد

زنجیر عرش هست و ندانم ز بهر چیست
آنجا که دست سلسله جنبان نمی رسد

دیدند اهل دل ثمر قد کشی سرو
آری سر غرور به ساماں نمی رسد

تا دست و پا بموج تبسم نمی زند
طفل شگوفه تا گل خنداں نمی رسد

در کاروان دهر ندیدند یوسفی
گرچه بر آمدست و بزنداں نمی رسد

دامن کشاں گذشت سر کشتگان خویش
دست کسے بگوشه داماں نمی رسد

ماهم وطوف دشت و بیاباں چو گرد باد
دیں خاک ما عمر گریزاں نمی رسد

بے راهبر مباش که این کاروان گل
بے سعی نامه به گلستان نمی رسد

هر چند تیز گرد بود دانه شبه
اما بآب گوهر غلطاں نمی رسد

بدام این نفس از افسوں نه از افسانه می آید
چنیں کار سترگ از همت مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرعه اخلاص شاداب است
سر شاخ ثمره خرمن بدوش این دانه می آید

دهد تا مژده جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیرا بر از کعبه تا میخانه می آید

مگر ضبط نفس شرط است در میخانه عرفاں
که بے قلقل شراب از شیشه در پیمانه می آید

عیاں از اهتزاز شعله شمع است این معنی
هوائے خوش زبال افشانی پروانه می آید

براه دوست عاشق از سر جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوهر یک دانه می آید

فغاں از مستی ساقی که دیدم کشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانه می آید

دریں زنداں تن از دم شمرد نهانیا سایم
نسیم جانفزا از کوچه جانانه می آید

سر دگر سر کشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانه می آید

ز حد خود گذشتن نیست کار باده پیمایاں

که جوشِ بادہ ایں جا تا خطِ پیمانہ می آید
بگردوں تیرہ ابرے بر شد و مستند میخواراں
که پندارند بر دوش ہوا میخانہ می آید
ز احوالِ سویدائے دلِ مضطر چہ می پرسی
که چوں اسپند در پرواز بیتابانہ می آید
ز پاسِ وضعِ رنداں نگزرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانہ می آید
فروغِ حسن را شد ناگزیر اسبابِ رسوائی
که ہر جا شمع روشن می شود پروانہ می آید
کلامِ بے ہنر کز گنجِ معنی ہست بے بہرہ
صدائے بوم را ماند که از ویرانہ می آید
نمی آید ز ہر کس رام کردن نفسِ سرکش را
چنیں کارِ سترگ از ہمتِ مردانہ می آید
قرابش تا کنم اے نظم از دل گریہ مینا
بگوشِ من صدائے خندۂ پیمانہ می آید

حرف ر

۷۴ ۲۶

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

نگاہِ ناز سے بسمل گرینگے بسمل پر
یہ وہ خدنگ ہے آتا ہی چھوٹتے دل پر

نظر ٹھہرتی نہیں روئے یار کے تل پر
چمک رہا ہے ستارہ سا ماہِ کامل پر

جہاں کی یہ بھی مصیبت ہی گردشِ فلکی
وہ بحر ہے کہ بھنور پڑ رہا ہے ساحل پر

پلک جھپکنے میں ہے منہدم بنائے جہاں
کھڑی ہوئی ہے عمارت آنکھ کے تل پر

نوائے شادی و غم دونوں یوں تھی دوش بدوش
کہ بس گیا گلِ نغمہ کفِ حلاجل پر

ہی تھا میں نے ابھی طے نہ وادیِ غربت
کہ پہونچی شامِ غریباں سوادِ منزل پر

ہمیں تو قلزمِ ہستی سے تھی عبور کی فکر
نہنگ بن گئی ہر موج آکے ساحل پر

ملی نہ عمکدہ دہر میں جگہ اتنی
کہ رو دوں بیٹھ کے میں نامرادی دل پر

اوتر کے بام سے آیا نہ پھر وہ رونقِ بزم
وہ نور پھر کبھی اترا نہ شمعِ محفل پر

چلی ہے دہر میں کیسی ہوائے بیدردی
کہ ہو رہی ہے ہنسی نالۂ عنادل پر

تو ہم سے سیکھ لے اے قیس طرزِ بیتابی
اتار لیتے ہیں لیلیٰ کو چڑھ کے محمل پر

الجھ کے دورۂ تسلسل میں رہ گئی جو گلو
انہیں ہے رشک مرے طوق اور سلاسل پر

پکارتی ہے یہ حسرت کہ ذبح کرکے مجھے
دیا ہے خون کا بٹکہ جبینِ قاتل پر

جو یاد آگئی ہے میرے دلکی بیتابی
پھڑک رہی ہے وہ انداز مرغِ بسمل پر

نہ پوچھو قافلہ والو یہاں کا کوچ و مقام
کہ اک کباب میں ہی ہاؤلی اک منزل پر

یہ بے ثباتیِ ساز طرب پکارتی ہے
کہ نغمہ رنگِ حنا ہے کفِ حلاجل پر

طوافِ شوق کو سیکھو انہیں پتنگوں سے
تڑپ رہے ہیں جو گر گر کے شمعِ محفل پر

نہیں مقام کا اس چلتی چھاؤں میں موقع
نہ بیقرار ہو مرنا پہنچ کے منزل پر

ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں
اٹھا کے راہ سے میں نے وہ رکھ لیا دل پر

نگاہ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا
چھری جگر پہ کوئی اب لگائے یا دل پر

ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں
ہزار حیف نہیں اختیار ہے دل پر

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراری دل
کہ منہ کے بھل میں گروں جا کے اپنی منزل پر

مرے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو
کہ ٹھوکروں میں پہنچ جائیگا یہ منزل پر

کسی کو قبر میں بھی پھر نہ پائیگا کوئی
کہ تین دن کے ہیں مہمان بہلی منزل پر

کجا وہ جلوہ گہ ناز تو کجا اے نظم
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ پہ اس دل پر

۷۵ ——— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ——— ۱۷

کوچہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور
اس گنبد بے در سے نکل چلیے کہیں اور

ہو سکتا ہے عالم میں جو ہو مہر مبیں اور
تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور

دل لیکے ستمگار ہوا برسر کیں اور
دو دل جان توڑ رہے کہ وہ بگڑے نہ کہیں اور

اللہ رے ساقی کا بجد ہو کے بلانا
کہتا ہوں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

زاہد ہے مرے اور ترے سجدہ میں فرق
شوق اور ہوس اور ہے دل اور ہے دیں اور

کوثر پہ بھی زمزم پہ بھی گذرا ہے تو واعظ
دیکھے ہیں کہیں ہم سے خرابات نشیں اور

خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا
لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

اس چھیڑ میں کوئی جو نہ مرتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہی کہیں اور ارادہ ہی کہیں اور

او، قاتل بے رحم کوئی دار ادھر بھی
محروم رہا جاتا ہی اک خاک نشیں اور

مر کر بھی ہمیں صور قیامت کا ہی دھڑکا
باقی ہی ابھی اک نفس باز پسیں اور

مرقد میں گرا جاتا ہوں میں بار گنہ سے
جھکتا ہی جو گردوں تو دبا جاتی ہی زمیں اور

وہ داغ جو قسمت میں لکھا ہی نہیں مٹتا
گھستا ہی جبیں ماہ تو ملتی ہے جبیں اور

اوڑنے میں لپکنے میں ہی شعلہ ترا توسن
ہی قہر کہ دیتا ہی ہوا دامن زیں اور

خوشبو سی یونہی ہو شب وصل کی شب تھی
گیسو ہوئی برہم تو کہلانا فہ چیں اور

کوچہ میں ہی تیرے غم عالم سے رہائی
پاتا ہوں ہوا اور فلک اور زمیں اور

تیر نگہ ناز نے کیا تفرقہ ڈالا
میں ہوں کہیں مسل جگر و دل ہی کہیں اور

وہ محفل ارباب صفا ہو گئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہی اب اک نظم خراب اور

۷۶ ——— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات ——— ۱۵

احسان لے نہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
رستہ بھی چل تو سبزہ بیگانہ چھوڑ کر

مرنے کے بعد پھر نہیں کوئی شریک حال
جاتا ہی شمع کشتہ کو پروانہ چھوڑ کر

ہونٹوں پہ آج تک ہیں شب عیش کی مزے
ساقی کا لب لیا لب پیمانہ چھوڑ کر

افعی نہیں کھلی ہوئی زلفوں کا عکس ہے
جاتے کہاں ہو آئینہ و شانہ چھوڑ کر

طول امل پہ دل نہ لگانا کہ اہل بزم
جائیں گے ناتمام یہ افسانہ چھوڑ کر

لبریز جام عمر ہوا آ گئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیر زال دہر کی ہم ٹھوکروں میں ہیں
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پہروں ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اونرا جو شیشہ طاق سے زاہد کا ہی حال
کرتا ہے رقص سجدہ شکرانہ چھوڑ کر

یہ سبحہ و ریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحہ صد دانہ چھوڑ کر

زندان میکدہ بھی ہیں اے خضر منتظر
بستی میں آئیے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے شیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع اور
جاتا ہی دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم بنا ہو گی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

۷۷ ——— ۱۵

بت کہتے ہیں کبھی کبھی تصویر دیکھ کر
سوجھی ہی دل لگی مجھے دلگیر دیکھ کر

فدا آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھ کر

پہلو سے دو گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں دفن میں تاخیر دیکھ کر

سایہ کے ساتھ دھوپ بھی شرما کے مٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھ کر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھ کر

سمجھے مری دعا کو ملک نردبان عرش
پیہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آ گئی
تڑپا میں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں پہ ہے حداثت سن کا یقین مجھے
پیہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئی ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہی ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

میر اگلا ہے ہاتھ مرا تم کو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظم کچھ فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

۷۸ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

مجھ کو یارب تو عطا کر دل نالاں دو چار
دل ہوں دو چار تو ہر دل میں ہوں ارماں دو چار

اے جنوں مجھکو دکھا عالم امکاں دو چار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دو چار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دو چار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دو چار

شادی و غم کو یہ مانا کہ بہم ہیں لیکن
سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار

نہ تو ہم تھے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے
تہمتیں چند لگائی گئیں بہتاں دو چار

سایہ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم
کاٹ دینگے اسی کملی میں زمستاں دو چار

رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے
آئی تھی خون کے آنسو سر مژگاں دو چار

ایک دانہ کی گرہ میں ہیں بہت سی خرمن
ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار

لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا
کہ ہزاروں میں ہوئی ہونگے پشیماں دو چار

کیا ملا تجھکو صبا کھول کے غنچہ کی گرہ
نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار

اتنے فرقے ہوئے کس طرح مسلمانونکے
یہ تو معلوم ہے اوترے نہیں قرآں دو چار

اپنے ساحل پہ جگہ دے ہمیں اے بحر کرم
تشنہ لب جھیل کے آئی ہیں بیاباں دو چار

پیکر خاک کجا اور کجا عقل و حواس
اوترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار

غم سے کیوں زرد ہی تو دیکھ تماشائے جہاں
رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار

کوچہ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضموں صفیں
میرے خامہ کیلئے چاہیئے میداں دو چار

ان میں کے ہی اشعار ہیں حاصل اے نظم
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

۷۹ ——— ۲۶

روئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر
ہنس دئے راز غم عشق کے کھل جانے پر

ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر
اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

تف ہی ای دور فلک اس ترے منجار پر
رشک ہی خضر کو سقراط کے پیمانہ پر

نہ تو یاروں پہ بھروسہ ہی نہ یارانہ پر
دیکھ دھوکا نہ یگانہ کا ہو بیگانہ پر

مجھ کو چھٹکے ہوئے تاری نہ دکھا ای گردوں
طائر عرش ہوں گرتا نہیں میں دانہ پر

سعی سی باز نہ آب رواں کے مانند
نقش تدبیر کا بن بن کے بگڑ جانے پر

حیف چھاتی پہ سلاطین کے دہر ہے پتھر
خس کی ٹٹی نہ ہوئی قبر کے تہ خانے پر

نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی
سو خزانے ہوں تصدق کروں ویرانہ پر

سلسلہ خواب پریشاں کا ہی بیداری بھی
ہوش آیا نہ ہمیں ہوش کے بھی آنے پر

نہ ملی موج حوادث سی تہمتن کو پناہ
تیغ پہ رکھی ہی جوشن پہ نہ دستانہ پر

حرص کیوں آئے یہاں تو ہی قناعت پہ گذر
کہہ دو مکھی کا ہی بخشا مری کاشانہ پر

کس طرح میں نہ تری دام میں آ لیتا
کہ مرا نام تھا لکھا ہوا ہر دانہ پر

چونکو ہشیار ہوا سے سایہ میں تو نیو الو
اب تو عبرت ہو تمہیں دھوپ کے ڈھلجانے پر

سو سخن شہر خموشاں میں لب گور پہ ہیں
ہمکو ہوتی نہیں عبرت کسی افسانے پر

سر کشو گور غریباں میں یہ کیا حال ہوا
سر اوٹھایا نہ کبھی پاؤں سے ٹھکرانے پر

کچھ نہ اندیشہ عقبیٰ ہی نہ فکر دنیا
رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر

اس زمانے میں نجانے تو کہاں تھا واعظ
دل کو جب ناز تھا قابو سی نکل جانے پر

کاسہ گرنے تو نہ پائی کہیں جمشید کی خاک
نام لکھا ہی تو لکھا رہے پیمانہ پر

جانفشانی میں اور انداز پر افشانیں
رشک پروانہ کو مجھ پر مجھے پروانہ پر

بادہ خواری کا برا ہو کہ ہے اوقات اب تو
مے کے گر جانے پہ ساغر کے چھلک جاتا ہے

نامۂ شوق کا طومار تو پڑھ کر دیکھو
رقص کرتا ہے کبوتر مرے افسانہ پر

اے نسیم سحری کس سے یہ سیکھی ہے ادا
چاک ہوتے ہیں گریباں ترے اٹھلانے پر

زرفشاں ہونے کو ناحق نکل آیا خورشید
ابر آمادہ تھا اس باغ میں برسانے پر

کیا خبر کون ہے بیہوش یہاں آپ ہیں کون
وہ بھی دیوانے ہیں جو ہنستے ہیں دیوانے پر

ہمہ تن گوش تو ہیں گل مگر اے مرغ چمن
کان رکھتا بھی ہے کوئی ترے افسانے پر

ایک جلوہ کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا اے نظم
بیخودی بزم میں چھائی رہی پروانے پر

۸۰ ——— ۲۱

دوش پر تیرے ہیں افعی کبھی رخسار و نبر
خود تنگر ہو عنایت ہے تمنگاروں پر

تاک انگور درختوں پہ چڑھی تھی کل تک
آج تو پھاند پڑی باغ کی دیواروں پر

بھیڑ کی تھی لب جاں بخش کا شہرہ سن کر
چشم فتاں نے چھری پھیر دی بیماروں پر

میں وہ نالاں ہوں کہ ہو بین کی پیدا آواز
ہاتھ دوڑاؤں گریباں کے گرفتاروں پر

رحم مجھ پر تو نہ آیا مجھے مرتے مرتے
مہربانی ہے یہ کیوں میرے عزاداروں پر

یا نہیں گردش میں مری قسمت اے تو دے کی شراب
منہ جو پوچھوں ہی تو ملکر تری رخسار و نبر

تلف عمر نہ زاہد ہے پریشاں کیسا
دیکھا رحمت کو اترنے جو گنہگاروں پر

جوش سودا میں یہ آتش قدمی تو دیکھو
کہ میں شعلہ کی طرح دوڑتا ہوں خاروں پر

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفتِ تیغ و ترنج
کوچھری پھر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوسِ لذتِ بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہے تو آتا ہے دل آزاروں پر

لطف یہ ہے ابھی کھنچی نہیں اُسنے تلوار
ٹوٹے پڑتے ہیں گنہگار گنہگاروں پر

باغ سے قوسِ قزح کی نظر آتی ہے طناب
خیمہ زن ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہو گیا مستوں کی جھرمٹ میں جو خورشید عرق
سرخ ہیں رنگِ شفق پھولی ہے خساروں پر

سختیاں عشق کی جسطرح ہے جھیلیں گے
ہم نے دیکھی ہے تجلی انہیں کہساروں پر

بڑھ گئی کس کی سواری فلکِ نقرئی سے
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

جب سے دیکھا عجبی انگشتِ شہادت کا طرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

میرے نالے کو جو کوسے یہ نہ آنے دوگے
چاندنی نکلے وہ رہ جائیگا دیواروں پر

دل تڑپتا ہے یہ شاید کسی دیوانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آنکھوں میں سرسوں پھولی
بیخودی چھائی گھٹا دیکھ کے گلزاروں پر

سختیاں طالبِ دیدار اٹھاتی ہیں عبث
ٹھوکریں کھا چکے موسیٰ نہیں کہسار پر

نالے سودہی فریاد ہی بیکار ہی نظم
رحم آیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

۸۱ ——— ۱۶

کروٹوں میں رہا پھولوں کی شاخ کیونکر
گندہ گیا ہار کی کلیوں میں مرا دل کیونکر

جذبِ دل کھینچ تو لے لیلیٰ و سلمیٰ کو ہم
دیکھیں تو آتی ہے محمل پس محمل کیونکر

گورے گالوں پہ ٹھہرتی ہے نظر مشکل سے
ہیں حسینانِ چمن کا جل کے بنی تل کیونکر

پا گئی راہِ فنا تو تو تڑپ کر اے برق
دیکھیں ملتا ہے ہمیں جادۂ منزل کیونکر

مجھ سے تو ضعف سے کروٹ نہیں بدلی جاتی
ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر

کسطرح باغ میں بہلے گا دلِ زار اپنا
اور سنی جائیگی فریادِ عنادل کیونکر

ہمتِ پیرِ مغاں کی ہے کرامات یہ سب
ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر

تین دن تو ہی ظلمات میں کشتی ہلال
آ گئی ڈوبتی ترتے لبِ ساحل کیونکر

برق رفتار ہے کیا قافلۂ عمرِ رواں
ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر

دل کو رکھونگا میں اب باندھکے زنجیروں میں
دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر

موجِ دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو
کشتیاں ڈوب گئی ہیں لبِ ساحل کیونکر

کچھ غبارِ سرِ رہ کو یہ خبر ہے معلوم
قافلے لٹ گئے آ کر سرِ منزل کیونکر

کچھ خبر شمعِ فروزاں کو ہے پروانہ کی
ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر

دل پہ درد تو شیشہ سے سوا ہے نازک
اب کہو صبر کی چھاتی پہ ہزاروں سل کیونکر

میں ہوں بیمارِ غم اور عمر کی منزل ہے پہلو
ناتوانی میں کروں قطعِ مراحل کیونکر

دورِ گردوں میں ہے بیقدری ارباب کمال
جائے حیرت ہے کہ چمکا مہِ کامل کیونکر

۸۲ ——— ۱۴

دھو کا زلفوں نے دیا عنبر سارا بن کر
سحر آنکھوں نے کیا نرگسِ شہلا بن کر

مرضِ عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا
پوچھ لو ان سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بن کر

ہوگئی زلف پریشاں تو کمر سے اسکی
حلقۂ زلف لٹکنے لگے چھلا بن کر

دن بھی نکلا تو بلائے شب فرقت منہ ٹلی
پیچھے دوڑا مری سایۂ شب یلدا بن کر

پی لیا تھا جو مرا خون تری ناوک نے
منہ سے سو فار کے نکلا وہ کلیجا بن کر

اسقدر خاک میں پنہاں ہیں تپان مہوش
گرد باد اوٹھے تو رہ جائے کلیجا بن کر

ہر طرح کی حرکت نام کو ہم رکھتے ہیں
اوٹھتے ہیں بیٹھتے ہیں نقش کف پا بن کر

اب مجھے صبح قیامت کی بھی امید نہیں
کہ فلک سر پہ گرا ہے شب یلدا بن کر

لاکھوں ہی شیشۂ دل روز ازل چور ہوئے
تب یہ تیار ہوا گنبد مینا بن کر

سبحۂ حضرت واعظ پہ تھا مجھکو شبہ
کہ گلا گھونٹ ہی ڈالے گا یہ پھندا بن کر

میری تصویر کھچی گر تری تصویر کے ساتھ
دیکھ لینا کہ بگڑ جائیگا نقشہ بن کر

باغ تو خوب ہی حسرت نے لگایا ہے مگر
مٹ نہ جائے کہیں دیکھو یہ گھروندا بن کر

خاکساروں کا تری شوق میں اوٹھا تھا غبار
رہ گیا ہے یہ وہی عرش معلی بن کر

کیا ہوا ای نظم بیاں صبر و قناعت کا مزہ
نعمتیں مجھ پہ یہ اتریں من و سلوی بن کر

۸۳ ——— ۱۲

درد نہاں یہ چھپے صاعقہ افگن ہو کر
یا کنول بجھ گئے الماس کے روشن ہو کر

بھیس بدلے ہوئے رہتی ہے قضا عاشق کی
عشوہ ہو کر کبھی مارا کبھی چتون ہو کر

کیا سیاہی شب ہجر انہیں ہے کیا تاریکی
رہ گیا شمع کا شعلہ گل سوسن ہو کر

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہی نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دیکھا کری روشن ہو کر

وصل سمجھوں کہ سی ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہو کر

ہی غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہی ہم کو
جادہ منزل عرفاں رگ گردن ہو کر

نگہ نازنے تاراج کیا خانۂ دل
چور بنکر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہو کر

نامرادی کا میں خوگر تھا برائی جو مراد
شکر منہ سی مری نکلا بھی تو شیون ہو کر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوئیں جب مجھسے
آگے قدموں پہ گریں حلقۂ آہن ہو کر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہو کر

سخت دل چیخ اوٹھی دیکھ کے حالت مری
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہو کر

لکھنو گردش گردوں نی چھڑایا ای نظم
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہو کر

۸۴ ——— ۱۶

سرو قد حشر اٹھا قامت دلجو ہو کر
فتنے بیدار ہوئی نرگس جادو ہو کر

شام ہی سی یہ شب عیش کا عالم دیکھا
تا کمر آگئی طول شب گیسو ہو کر

صبح ہی ای شب عشرت تری صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرہ خورشید کو گیسو ہو کر

نیتیں مان رہا ہی مری مرنی کی فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہو کر

لب پہ ہی مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید ٹپک پڑتی ہی آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نہ نکلیں مری لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

یک بیک پھونک دامنِ صبح اُسنے شبِ وصل
شعلۂ شمع اوڑا جاتا ہے جگنو ہو کر

دل نے دنیا سے لگایا کہ ہیں آزادہ روش
چمنستاں میں ہی بھی تو بسی بو ہو کر

لے گیا عہدِ جوانی نہ ہمیں ساتھ افسوس
ڈھونڈتے رہ گئے گردِ رہِ آہو ہو کر

راہ میں خشک راعت تھی نہ دیکھی ہی اُسے
کیا برستا ہوا جاتا ہے لبِ جو ہو کر

لے گئی عرشِ معلی پہ مجھے فکرِ سخن
جا پڑی پرتو آئینہ زانو ہو کر

بے سبب قتل کیا پھیر کے چتون اُسنے
چل گئی دل پہ چھری جنبشِ ابرو ہو کر

آئینہ اس کو دکھانے جو لگا جوشِ سرشک
رہ گیا سکتہ میں وہ سرو لبِ جو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہی تو جگر ایک طرف
تو لتی ہی نگہِ ناز ترازو ہو کر

مجلسِ ہر مغاں سی نہ انھیں سے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں دو زانو ہو کر

قدرِ ای نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز
دامنِ دشت میں مہکا گلِ خودرو ہو کر

۸۵ ——— فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ——— ۱۲

آستینیں تو چڑھائی ہیں مری تعزیر پر
کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہے کس تقصیر پر

پانی اس صحرا میں نایاب ہی زخمی کو یاں
ایک قطرہ آب اگر دیکھا تو نوکِ تیر پر

آن ہی جن کی طبیعت میں عجب مشکل ہیں ہیں
ہر قدم اس کارواں کا ہی دمِ شمشیر پر

سعی لاحاصل سہی میں باز آنیکا نہیں
ہنسی دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر

صبر کی تلخی میں بھی لذت ہی وہ واقف نہیں
کھیتوں کی طرح جو گرتے ہیں شہد شیر پر

دل میں تھا صیاد کے خود صید ہو جانے کا خوف
ٹوپساں اونی چڑھا دیں دیدۂ نخچیر پر

پہلے تو وہ گذر جو کچھ کہے عزم بلند
بعد اسکی کر بھروسا خواہش تقدیر پر

اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
ہی بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر

خوف رسوائی سے اٹھتی ہی صدا جھنکار کی
گر کسی کی آنکھ پڑتی ہی مری زنجیر پر

خاک کی چٹکی ہی کافی خاکساروں کیلئے
کیا دوا ہر درد کی موقوف ہی اکسیر پر

کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں
آ رہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک درجاناں کجا
نظم مجھ کو ناز ہی اس خوبی تقدیر پر

۸۶ مفاعلن فاعلن فعولن دو بار ۱۸

ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہو کر

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہی خضر رہ طریقت
رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازہ زنگ ہو کر

نہ توڑتے ارسی اگر تم تو اتنے یوسف نظر نہ آتے
یہ قافلہ کھینچ لائی سارا شکست آئینہ زنگ ہو کر

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہی فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بنکر کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہے بحر فنا کا دھارا کہ مجھکو الجھا کے مارا مارا
نفس نے موجوں کا جال بنکر لحد نے کام نہنگ ہو کر

ملا دل ناحفاظ مجھ کو تو کیا کسی کا لحاظ مجھ کو
کہیں گریباں نہ پھاڑ ڈالیں جناب ناصح بھی تنگ ہو کر

جواب کی مینائے مے کو توڑا چلی گئی تلوار محتسب سے
لہو بھی رندوں کا دیکھ لینا بہا مے لالہ رنگ ہو کر

نہ ضبط سے شکوہ لب تک آیا نہ صبر نے آہ کھینچ دی
رہا دہن میں وہ قفل بنکر گرا یہ چھاتی پہ سنگ ہو کر

سمجھ لے صوفی اگر نہ نکتہ ہے ایک بزم سماع قیمتی
تو نو پیالی یہ آسماں کے بجیں ابھی مل ترنگ ہو کر

بھلا ہوا فسردہ خاطری کا کہ حسرتوں کو دبا کے رکھا
بچا لیا ہر رگی سے اس نے لحاظ ناموس و ننگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے بھیس صدہا اسے ڈرایا اسے لبھایا

کبھی زن پیرزاں بنکر کبھی بت شوخ و شنگ ہو کر
اوٹھی تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میری دل کی حسرت شہید تیغ درنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم یاس و خلل میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ و دنگ ہو کر

۸۷ مفاعیلن ۴ بار ۱۳

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اٹھے میں دھواں ہو کر گرے میں بجلیاں ہو کر
کچھ آگے بڑھ چلی سامان راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گرد کارواں ہو کر
کسی دن تو چلے اے آسماں باد مراد ایسی
کہ اتریں کشتی مری گھٹا میں بادباں ہو کر
نہ جانے کس بیاباں مرگ نے مٹی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر
وفور ضبط سے بیتابی دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آکے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر
گلو گیر اب تو ایسا انقلاب رنگ عالم ہے

کہ نغمے نکلے منقارِ عنادل سے فغاں ہو کر
جو ہو کر ابر سے مایوس[1] خود سنجی کبھی دہقاں
جلا دیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہو کر
جہاں میں واشدِ خاطر کے ساماں ہو گئے لاشے
جگر راحت کی ناممکن ہوئی ہے لامکاں ہو کر
ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس دارِ ماتم میں
اگر رہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہو کر
الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے میں نے
کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہو کر
گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں
چمن تک آگئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہو کر
دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ
یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہو کر
جو ڈرتے ڈرتے دل سے ایک حرفِ شوق نکلا تھا

[1] مایوس فارسی والوں کا ترا شا ہوا لفظ ہے اور لغات نویس ہی علماء عالم ہیں فصیح ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہو گیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے مخوس بھی مایوس کے قیاس پر فارسی والوں کا ترا شا ہوا ہے۔ ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں پر داستاں ہو کر
نکل آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو
بنا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکریاں ہو کر
نزاکت کا یہ عالم پھول بھی توڑے تو بل کھا کر
نہ جانے دل میرا کس طرح توڑا پہلواں ہو کر
نذر و کبک پر ہنس کر اوٹھی خود لڑکھڑاتے ہیں
سبک کرتے ہیں اُن کو پانچے بارِ گراں ہو کر
گلا گھونٹا ہی ضبطِ غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے
کہ نکلے منہ سے آوازِ شکستِ دل فغاں ہو کر
پتہ اندیشۂ سالک نے پایا منزلِ دل کا
تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہو کر
ہوئی پھر دیکھیے آبستنِ شادی و غم دنیا
ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت توامان ہو کر
جو نکلی ہو گی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا
تمہارا تیرِ حسرت بن گیا دل میں نہاں ہو کر
اوتر جائیگا تو او آفتاب حُسن کوٹھی سے
گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۸۸ ولہ ۷

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک ہنس رہا ہے آئینہ بختِ سکندر پر

خبر دیتا ہے بیتابی کی اشکِ خوں سرِ مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوکِ نشتر پر

مے عرفاں کہ جھوٹی کی ہوئی ہے میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اُس شراب روح پرور پر

بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہے قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر

بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بار عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بار امانت کم نہ تھا سر پر

کہیں ایسا نہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر

جو اشک آنکھوں میں بھر لائی ہو آئینہ دکھا دو نیں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسارِ گلِ تر پر

۸۹ فاعلاتن مفاعلن فعلات ۸

آفریں شوق گام فرسا پر | گر کے اٹھا ہوں میں ہر اک جا پر

باندھی ہے مدح شہ کی دھن میں نے
نغمۂ عندلیب شیدا پر

دے خدا گر دل و زباں تو کرے
شکر راحت پہ ہم برائے ادا پر

جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
بہ رہا ہے یہ قصہ دریا پر

ق

آسماں پھینکتا ہے سنگِ جفا
تاک کر قلب ناشکیبا پر

رقص اس گنبدِ زبرجد کا
ہے صدائے شکست مینا پر

کچھ سلیمان سے بھی زیادہ ہے
ناز منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیر زن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاقِ کسریٰ پر

حرف ش

۹۰ ——— ۱۴

خار حسرت کو ہے جگر کی تلاش
گل داغ جنوں کو سر کی تلاش

عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش

اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈ لیا
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش

میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش

میکدہ کو ہمارے ڈھونڈ لیا
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش

سرمہ خوش چشم کو ہے مد نظر
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش

جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف
صبح قد ہے رات بھر کی تلاش

دوپہر تک تھا انتظار اوس کا
دوپہر تک رہی سحر کی تلاش

مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب
رہی آئینہ سحر کی تلاش

غرق رہتا ہوں فکر مضمون میں
ڈوب کر چاہیئے گہر کی تلاش

یا الٰہی ہو ایسا جوش بہار
رگ گل کو ہو نیشتر کی تلاش

دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا
کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے نظم
ہو گئی ختم عمر بھر کی تلاش

۹۱ ——— مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہٗ ——— ۱۰

شب قدر ست زلف عنبر نیش
طلوع صبح عید است از جبینش

شہ باذل کہ حق یادش نگہبان
بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش

چناں آراست ملکش در زمانش
کہ مثل آسماں شد سر زمینش

معظم جاہ شد ماہ تمامش
چو اعظم جاہ شد مہر منیرش

رواں کردست دریا در بیاباں
کہ باشد بحر عمان در کمینش

فلک نیلی ز عکس آبگونش
زمیں سرسبز از ماء معینش

زہے ایں چشمہ سار صاف و شیریں
عیاں راز دل از چین جبینش

چناں کشت و کن را کرد شاداب
کہ عذر ابر فلک شد خوشہ چینش

کنارِ رود موسی داد ریگاه
که موسی خاتم است و او نگینش

زہے شاہیکه در قالب مدروح
صریر کلک معنی آفرینش

۹۲

ولہ

۱۳

طلسمے بیش نبود لجۂ ہستی و سیلابش
که برہم میزند موج فنا صد نقش بر آبش

زند صد قافله پے ہم کند صد سلسله برہم
گه از ابروئے پُر چینش گه از گیسوی پر تابش

دوائے درد دل باشد لب آں عیسی دوراں
که دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش

چو اکسیر وفا خواہی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور که بیتابیست سیمابش

رگِ نخوت ہمی باشد طناب گردن ظالم
که بر خاک مذلت میکشد از فرش کمخابش

به زخمِ ابروے او لذت آزارده چنداست
که بوئے مشک می آید ازیں تیغ سیه تابش

اگر سر می نہم بر پائے نازک سرگراں گردد
وگر سر می کنم افسانه غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب پے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چوں آب خواہد ریخت دولابش

بگورستان سر فغفور می بینم سر خشتے
کجا شد بالش قاقم کہ بد نازش گہ خوابش

اگر برخاست روئے گرد باد از آہ مظلوماں
شکست او تاد ایں نہ خرگہ نیلی و اسبابش

دریں جوش سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر بر زد حباب آسا بچو بر دسیلابش

عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ بر گیرد
دل خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش

نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہ دیدار معنی بابش

حرف ض

۹۳ ——— ۱۰

چھا ابر نے اوڑتی ہوئی دی ہے فیض
ساقی نظر فیض ہو ساقی نظر فیض

کانٹوں پہ ہے وہ راہ تو آنکھوں پہ ہے بستر
اک وادی ہے اور وہ اک رہ گذر فیض

آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق
تھمتے نہیں کتنی نہیں شوریدہ سر فیض

کہتے ہیں جسے چشم طلب وہ تو ہو پیدا
اک جنبش مژگاں سے کہیں لاکھ در فیض

طوبیٰ لکم اے اہل کرم واہ ری رفعت
لے اوڑتے ہیں طوبے کی طرف بال پر فیض

ای سرمغاں دست نگر تیرے ہیں سنگیں
ہاتوں کی لکیریں ہیں کہ رہ گذر فیض

کیا اہل قناعت کو غرض اہل غنی سے
ہم کو ہے فیض اب نہ اوہیں در سر فیض

تراہ تجھ کیا اس کی کریمی سے عجب ہے
توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے در فیض

گر جاب جوادث میں ہوں ای مبدء فیض
اتر جاؤں میں ہو جائے جو مجھ پر نظر فیض

مانند نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اوٹھ جائیں گے ہم چھوڑ کے اپنا اثر فیض

حرف (ف)

۹۴ ——— ۱۶

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف
چلا ہے چھوڑ کی بسمل مجھے ہرن کی طرف

بنایا توڑ کے آئینہ آشیانہ
نہ دیکھی راہ جو خلوت سے انجمن کی طرف

رہ وفا کو نہ چھوڑا وہ عندلیب ہوں میں
چھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کی طرف

گریز چاہیے طول امل سے سالک کو
سنا ہے راہ یہ جاتی ہے راہزن کی طرف

سراغ کو ہر میں ہو گئے غافل کو کب تک
اٹھو تو کیا نہیں جاتا نہیں وطن کی طرف

یہ اہل دل ہیں الگ ہیں وہ اہل ملا سے
نہ میں ہوں شیخ کی جانب نہ برہمن کی طرف

لے آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہانِ حادثہ آگیں میں مشکلا ورود
گذر حباب کا دریائے موجزن کیطرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو باد بہار آئیگی چمن کیطرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کیطرف

گواہ کون مرے قتل کا ہو محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کیطرف

خبر دی اٹھ کے قیامت نے اسکے آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کیطرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئی گل نرگس ہیں یاسمن کیطرف

تمام بزم ہے کیا محو اوس کی باتوں میں
نظر دہن کیطرف کان ہے سخن کیطرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوب کے مرنے چہ ذقن کیطرف

یہ مسکینوں کی ادا اور بھی سیکھ گئے
اکھڑ رجو سے جو اٹھے چلے چمن کیطرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت اے نظم
کہ اوڑ کے خاک شفا آئے خود کفن کیطرف

۹۵

(۸)

کیوں میں سیدھا گیا وحشت میں بیاباں کیطرف
ہاتھ جسطرح سے آتا ہے گریباں کیطرف

بیٹھے بیٹھے دل ہمیں کو یہ کیا لہر آئی
اوٹھ کے طوفان چلا دیدۂ گریاں کیطرف

دیکھنا لالۂ خودرو کا لہکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کیطرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہار شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گل خنداں کیطرف

بات چھپتی نہیں بنتی ہیں نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف دیکھ کے [illegible] کیطرف

سیکڑوں داغ گنہ دھوگئے رحمت تری
کیا گھٹا جھوم کے آئی تھی گلستاں کیطرف

چشم آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی
دیکھتا تھا یہ بت زلف پریشاں کیطرف

سر جھکائے ہوئی ہے نظم بیان خامہ
سمت سجدے کی ہے تیری خط فرماں کیطرف

حرف ق

۹۶ ——— ۱۲

خاک جاں پر ہو قبلہائے فراق
لے چلی قبر میں بلائے فراق

ہے فلاطون عشق کا ارشاد
شربت مرگ ہے دوائے فراق

منہ بنانا ہے طرز نازش وصل
منہ پھرانا ہے اک ادائے فراق

شب فرقت ابھی سحر ہوگی
لب تک آئیں تو نالہائے فراق

تھے مزے عشق کے جوانی تک
ہائے لطف وصال ہائے فراق

وصل کی تو دعا قبول نہیں
مانگنا چاہیے دعائے فراق

ہو گئی صبح رہ گیا قصہ
تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق

تا فلک پہنچی تا اثر نہ گئی
واہ ری آہ نارسائے فراق

چشم پرخوں کا جام پر ہے یقیں
گریہ سمجھا میں خندہ ہائے فراق

کشتہ سیماب اضطراب کا ہے
دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق

ساغر بادہ ہے دل پرخوں
شور فریاد ہے صلائے فراق

جی بچا گر تو وصل یار سے پھر
جھیل لے نظم سب جفائے فراق

حرف م

۹۷ — ۱۷

نہ پا سکے گل مقصود اس بہار سے ہم
اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم

ادھر تھی بادیہ کے تجلی خورشید
جھلک دیکھ سکے پردہ غبار سے ہم

اثر سے روز کے ہے وہ ہمارے حسن اسیر
شکار کھیلتے ہیں دام آبشار سے ہم

فنا ہوں یوں کہ ملے بعد اس کے عمر ابد
نکالیں آب بقا ظلمت مزار سے ہم

رہیں گے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں
پیادہ ہوئے نکل جائینگے سوار سے ہم

کمند بام حقیقت تھا عشق قامت یار
فلک پہ چڑھ گئے عیسیٰ کی طرح دار سے ہم

خدا کے واسطے جابر اسی کہے نہ کوئی
اٹھا رہے ہیں یہ جبر اپنے اختیار سے ہم

نشان کسی کو ہو معلوم عمر رفتہ کا
صدا یہ سنتے ہیں ہر قبر کے غبار سے ہم

مٹی نہ کاہش جان رنج میں راحتیں
خزاں سے غم مجھے حاصل ہوا بہار سے ہم

ہوئی کہ [illegible]
[illegible]
نہ خواب میں بھی [illegible]

عدم سے دہر میں رنج سے آئے محشر میں
مکان پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم

خبر یہ صور میں تھی ہو کریم کا دربار
یہ شور سن کے نکل آئے ہیں مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں
غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم

غضب کا رقص فلک نے ہمیں دیا دھوکا
رہے نہ آپ میں اک جلوہ شرار سے ہم

ہزار معرکہ امتحان ہوئے اے نظم
کسی سے کم نہ رہے فضل کردگار سے ہم

۹۰ ——— ۱۲

جاں در ہوائے بادۂ اطہر فروختیم
دل در بہائے ساغر کوثر فروختیم

در کار سائلاں ز رو زیور فروختیم
وز بہر حفظ نام و نسب سر فروختیم

تا دل بہ آں دو زلف معنبر فروختیم
خود را فروختیم و مکرر فروختیم

جاں را برائے آبروئے خود فشانده ایم
سر را پے گرفتن افسر فروختیم

در ماندہ ایم زیر فلک چوں ہلال و بدر
تا تیغ آوریم بکف سر فروختیم

تا جا گرفت در دل ما خوف باز پرس
از رنگ روئے خود ورق زر فروختیم

ترک خودی جز اشک ندامت بہانہ داشت
آئینہ ہا در آبدو گوہر فروختیم

در شعر من بخوں جگر پا فشردہ ایم
[illegible] گل تر فروختیم

رفتی غبار طبع بہ شیریں تبسمی
[illegible] فروختیم

افتاد تا معامله با رحمت خدا — تا نامه سیاه به محشر فروختیم
رود او خانقه مستی ما میکشان مپرس — دستار را به شیشه و ساغر فروختیم
وارستگی ما بخرام کسی مپرس — خود را بدست فتنه محشر فروختیم

ولہ

۹۹ ——— مفتعلن فاعلات مفتعلن فا ——— ۱۱

همتی از باد صبح گاه گرفتم — رفتم و از غنچه دمن آه گرفتم
عزم شبی خون ترا مبارک و فرخ — فال ز بشکستن کلاه گرفتم
دل بغم تو نداشت تاب صبوری — اشک سراسیمه را گواه گرفتم
منفعلم از وفا بعرصه محشر — دامن یوسف باشتباه گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست — باده به پیمانه نگاه گرفتم
خار غم از بسکه داشت تشنه لبیها — خون دل از نبض برق آه گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاهر من آب — نکته چو بر آب زیر کاه گرفتم
از قدمم گرد باد تارگ ابر است — من ز بیابان سراغ چاه گرفتم
خاک بچشم فشاند و قافله بگذشت — سرمه عبرت ز گرد راه گرفتم
نفس ستمگار را بکشم و آنگه — دست و گریبان عذر خواه گرفتم

شعر اسیر است نظم شمع ره ما
آتش از آن گرمی نگاه گرفتم

حرف ن

۱۰۰ ——— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ——— ۲۰

مزہ بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چل بسے کہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم خاک و فگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت سے میں بدلتا ہوں
کہ ایسی رات کوئی عمر جاوداں میں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کیا بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

مجھی پہ جو صبا نکلیں گے آج قاتل کے
مرے سوا کوئی میدان امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سوکے اٹھے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
مزاج پوچھیے یہ جرأت فغاں میں نہیں

چھپا دیا ڈال دی میرے دل میں انکی ناصح
مجھے عجب ہے کہ چھالا مری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سرگرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشہ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری بدرنگیوں نے اے غم عشق
وہ داغ جو پر طاؤس آسماں میں نہیں

مرا نصیب غم نے پایا تو چین آیا
کہ آج صورت خمیازہ کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میرے شرر جو آہ میں ہے
وہ کہربا میں نہیں ہے کہکشاں میں نہیں

فلک پہ شکر ہے اس کی طرز دامن پر
ستارے ایسی یہ تحریر کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں پردہ کتاں میں نہیں

وہ کاش سائل دیدار کو جلا دیتا
کوئی شرار ترے سنگ آستاں میں نہیں

ہے ایک قافلہ رنگ و بو و عمر رواں
متاع درد محبت جو کارواں میں نہیں

رہی کشتی تن غرق ہو کے خشکی میں
جو خاکداں میں کشش ہے وہ بادباں میں نہیں

بزور ہمت مردانہ توڑ ہفت حصار
کہ راہ بند ہے رستم جو ہفت خواں میں نہیں

جو طبع رمز شناس و کنایہ فہم نہو
تو کچھ مزہ گل و بلبل کی داستاں میں نہیں

برا نہ مان جو پہنچے کسی سے رنج ہے ظلم
کہ ہو شمار کوئی دور آسماں میں نہیں

۱۰۱ ——— ۱۵

حریف تم نہ سہی دوستدار بھی تو نہیں
وہ آنکھ اب نہیں وہ چاہ و پیار بھی تو نہیں

مرا لہو ہے زاہد جو پی نہ لے یہ جام
کہ دن ہے عید کا تو روزہ دار بھی تو نہیں

چمک گئی ہے کچھ ایسی کہ ابر و برق ہے مات
ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار بھی تو نہیں

نہیں میں مستی ناپائیدار کا قائل
کہ مستعار کہوں مستعار بھی تو نہیں

اٹھاؤں ظلم میں کس کس کا نو فلک میں عدد
کہ دل تو ایک ہے دو تین چار بھی تو نہیں

ہے ایک تار مرے جسم زار کو کافی
مگر کفن کے لئے ایک تار بھی تو نہیں

لحد کا پائیں گے کس طرح سے پتہ بعد
جنوں میں ایک جگہ پر قرار بھی تو نہیں

دل و جگر کئے تیغ نگاہ سے چور چور
پھر اس پہ لطف یہ ہے آنکھ چار بھی تو نہیں

نہ دل لگا کے کبھی درد دل سنا میرا
ہزار بار کہا ایک بار بھی تو نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر
کہ تار تار یہ ہے کچھ ستار بھی تو نہیں

کریم حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا
کہ بے حساب گنہ ہیں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں
ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھکو توسن عمر
وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اوڑانے آئے تھے ہم خاک کو فضا میں
زمیں پہ سر ہیں سر ریگزار بھی تو نہیں

ہیچ ہے نظم ہے بیہودگی میں سوائی
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۱۰۲ ——— ۲۵

تو ایک آہ میں اے چرخ کج مدار نہیں
جو خاک ہیں نہ ملا دوں تو خاکسار نہیں

کسی سے کیسے امید کشود کار نہیں
مجھے اجل سے بھی آنے کا اعتبار نہیں

جھکوں جو اہل تجبر سے خاکسار نہیں
فلک سے دب کے رہی جو وہ یہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں
کہ شمع بھی مری محفل میں تا جدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رنگزار نہیں
کہ ہستی گذراں کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گذراں ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ عالم رنگزار ہے

نہ آن بان طبیعت میں ہو تو ساماں کیا
کہ ہمیں بل نہ ہو تو استوار نہیں

سنبھالے کون کسی کو کسی کی خبر
تمام بزم میں کوئی بھی ہوشیار نہیں

یہ مجھ سے دوست کا نقشہ بنا کے کہتا ہے
مزاج یار ہوں کچھ میرا اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہے صیاد
کہاں میں تیرے قزاک میں شکار نہیں

جواب نامہ کا قاصد مزار پر لایا
کہ جانتا تھا اسے تاب انتظار نہیں

یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

زمین سخت فلک دور ہے بشر مجبور
مزہ ہے جان بھی دینے پہ اختیار نہیں

قریب تر رگ گردن سے بھی ہے اس کا دور
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آشکار نہیں

کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
وہ صاعقہ نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں

جو وہ ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ زینہار نہیں

چھپے جو خال شہیداں پہ اس گلی کا ہوا
چراغ لیکر بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں

کھڑے ہیں ہم کہاں [illegible]
نہ کھا فریب یہاں نخل سایہ دار نہیں

گذرتے ہیں چمن مستعار مثل نسیم
کسی کو خار نہیں ہیں کسی پہ بار نہیں

عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں

وہی سی کہہ تیری کہنی پہ جو چلے ناصح
ہیں ہرزہ گرہ نہیں ہیں ہرزہ کار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

فلک ہے وہ شتر کینہ ور خدا کی پناہ
عقال پاؤں میں جسکے نہیں مہار نہیں

ملی جو چشم حیواں کی تو میں عظیم رہیں
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں مزار نہیں

مقرر دل میں تو دشمن زباں سے کوئی ہو
جو چوٹ کھا کے نکل جائے کیا شکار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظم
وہ کون شعر ہے جو در شاہوار نہیں

۱۰۳

نہ اہل دل سے نہ اہل نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بیخبر سے پوچھتا ہوں

وفور شوق میں کھویا گیا ہوں میں ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشم حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاک جم کی مجھے
میں خشت گر سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گرد پس کارواں قدم آدم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گذر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ درد جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہے خضر اگر ساتھ ہو لئے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہ بر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنی جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقش قدم تو رہروؤں کا پتہ
میں اب غبار سر رہ گذر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جام صبوحی کا شاخ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیم سحر سے پوچھتا ہوں

شجر ہیں وجد میں کیوں گل ہیں کس لئے بیخود
یہ حال بلبل شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز سر حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا میرا ہی کیا اوک ستم کے لئے
یہ آج قاتل بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہوگا کیا اے غم
مآل کار کو میں پیشتر سے پوچھتا ہوں

۱۰۴

۱۴

۱۸

جو دل کو پیس کے پھینکیں تو آرزو نہ کریں
جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں

وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں
شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں

نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا
رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں

وہ اشک کیسے پھپھولے نہ جن سے پڑ جائیں
وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں

کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں
کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں

جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا
کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں

گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سے لب ملائے ہیں
دہن پہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں

قسم یہ دیکھے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے
مرا لہو پئیں دل اگر لہو نہ کریں

حریف بنکے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو
شراب حلق سے اتری ہوئی لہو نہ کریں

وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو
وفور شوق میں کیوں سجدہ چار سو نہ کریں

مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہے سر راہ
کہ پاؤں چلتے ہوں اور تیری جستجو نہ کریں

گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھاتے شرم
ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں

وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوں کہ کبھی
حسین جہاں کے مراد کر بے وضو نہ کریں

جو دل پہ رکھیں تو رکھیں نہ دل میں کوئی ہوس
جو دل کریں تو کسی شے کی آرزو نہ کریں

جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں
مقام پھر کوئی دم مثل آب جو نہ کریں

ملا ہے یہ گل صد برگ سے سبق ہم کو
ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں

نماز میں نہ ہمیں قتل نفس ہو منظور
تو آستین الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظم آخر کار
جو یوں گیا اسی جانے دین جستجو نہ کریں

۱۰۵ ——— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات ——— ۲۰

چھٹکی ہے چاندنی سی دل پاکباز میں
ہے داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں

آتی تھی بوئے ناز جو عرش نیاز میں
خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں

کچھ مجھ کو یہ خیال بھی ہے مشق ناز میں
پامال ہو گیا کوئی اس ترک تاز میں

جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں
وہ خوبیاں نہیں ہیں بتان طراز میں

ڈھیلے پڑے ہیں بند قبا خواب ناز میں
نقد وصال ہے گرہ نیم باز میں

نیچی نظر ہے شرم کی اونچی ہے قہر کی
بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں

دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو
اب کے گرہ لگائے زلف دراز میں

دل میرا اس طرف ہے ادھر دل رقیب کا
دونوں کو تولئے نظر امتیاز میں

بے پردہ ہو گیا ہے تجلی سے حسن یار
ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں

تیری زباں سے آگ لگی شمع انجمن
میری زباں کو دخل نہیں میری راز میں

تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز برا سمجھ
لغزش محال ہے قلم کارساز میں

پردہ میں نغمہ زن ہے تو دھوکا ہی کھا گیا
ہے جسم میں یہ روح کہ آہنگ ساز میں

کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر
جیتے ہو کس طرح سے غم جانگداز میں

پھانسی لگا رہی ہے اجل کیا بری طرح
الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو
پھنستے ہیں شیر دام گہ حرص و آز میں

خالی نہیں فریب سے عیش اس جہاں کا
ساغر شراب کا ہے کف شیشہ باز میں

اس بحر پر خطر میں ہوں میں جس کی موج سے
ڈر کر ہوا سوار تلاطم جہاز میں

وہ صید پر شکستہ ہوں پائی ہے پر نہیں
میں نے ہوائے بال و پر و شاہباز میں

تسبیح اوسے بعد پڑھی بھی تو کیا خضوع
سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں

تھا طاعت خدا میں بھی یہ حال نظم کا
تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

١٠٦ ——— ١٥

مبرم قضا سے عشوہ سحر آفریں نہیں
جادو کی ہے یوں نگہ شرمگیں نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہگیں نہیں
ہے دل تو سب کے پاس یہ آفت کہیں نہیں

رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں پہ ہے
سنبھلو زمیں ہے فلک ہفتمیں نہیں

چنبر کی طرح رنگ بدلتا ہے آسماں
کیونکر کہوں کہ نالہ دل آتشیں نہیں

او تنگ دل یہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے
افعی کی کنجلی ہے تیری آستیں نہیں

سر میں بھرا ہوا ہے تیری بادہ غرور
موج شراب ناز ہے چین جبیں نہیں

سرمہ سے کر دیا ہے سخن گو غزال کو
کم سامری سے غمزہ سحر آفریں نہیں

پینے میں خون دل کے حلاوت کہاں کی ہے
حیراں ہوں شکر میں نہیں انگبیں نہیں

جنت میں لطف کوچہ دلدار کا سہی
لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں

کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا
واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار سزاوار لطف ہو
جنت بھی مل چکی مگر اب تک یقیں نہیں

نالے اگر کے تو اڑاؤں گا خاک میں
یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں

چھپکے جو آنکھ ہجر کی شب میں تو کس طرح
او جھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں

دوزخ میں میں ہلاک کے پکاروں گا یا کریم
آئے نہ مجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون جس پہ کسی سے چھٹ رہا

۱۰۷ ——— قرآں اٹھائیے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں ——— ۱۳

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں کہیں
اپنا ہی اس جہاں میں نہ پایا نشاں کہیں

مژگان تر سے بچکے چلے اے امیر سحاب
ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں تری دھجیاں کہیں

یارب وہ تیرگی شب غم کی ہوئی نمود
بنجائے یہ سمٹ کے نہ پیل و ماں کہیں

سمجھے تھے ہم کہ سجدۂ طاعت ادا کیا
دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں

گنبد میں آسماں کے چھپا تھا قضا سے میں
کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں

باتیں بنا بنا کے وہ مکرے تو کیا عجب
جس نے کہ ایک بات میں سو مکر ہاں کہیں

وقت غیر نہ شیشہ سے نازک ہی ڈر رہے
پتھر کی سل بنے نہ یہ خواب گراں کہیں

کیا سر کے بل گئی ہیں عدم کی سفر میں لوگ
اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں

آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک
نالاں ہوں میں کہیں جرس کارواں کہیں

لے چل مجھے بھی اے شب عشرت تو ساتھ
ڈرتا ہوں میں قصاص نہ لے آسماں کہیں

دل اسطرح ہوائے محبت میں جل گیا
بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

عالم یہ ہجر میں ہے کہ بیٹھے کہیں ہیں ہم
دل ہے کہیں خیال کہیں ہے گماں کہیں

اے نظم سانپ کاٹ کے پیٹے تو کیا ہے غم
ہاں دیکھنا پلٹ کے نہ کاٹے زباں کہیں

۱۰۸ ——— ۱۵

تیرے قدم قدم پہ مجھے آئے جاتے ہیں ۱
اور دل کے ولولے ہیں کہ دوڑے جاتے ہیں

ضحاک روزگار بنا کاکلوں سے تو ۲
دو سانپ ہیں کہ دوش پہ بل کھائے جاتے ہیں

کیا پھڑپھڑا رہا ہے دل زار رشک سے ۳
وہ مرغ نامہ بر کو جو چھڑکائے جاتے ہیں

آہ آسماں پہ تارے کے آنکھ لگی لگاتی ہے ۴
نالے فراز عرش کو پھرائے جاتے ہیں

گویا کہ آگیا ہے ستاروں میں آفتاب ۵
جتنے حسین ہیں سب پہ وہی جھلکے جاتے ہیں

دیوانہ میں ہوں اب کہیں صبح کوئی بتائیے ۶
سمجھے نہ سمجھے کوئی وہ سمجھائے جاتے ہیں

آنکھوں میں رہتے رہتے وہ دل میں سما گئے ۷
پائی جگہ تو پاؤں کو پھیلائے جاتے ہیں

بندہ تو اس ادا کا ہے اہل کرم کی ہوں ۸
دیتے ہیں او رآپ ہی شرمائے جاتے ہیں

دیکھا تھا دیکھتے ترے بام بلند کو ۹
چکر فلک کو آج ملک آئے جاتے ہیں

سبحہ لا کر یہ سبح ہنڈولے میں چرخ کے ۱۰
ہم دور ہی سے دیکھ کے تیورائے جاتے ہیں

مجھ سے سوال کرکے نکیرین دنگ ہیں ۱۱
حاضر جواب سے وہ گھبرائے جاتے ہیں

باریک ہے جو بال سے درپیش ہے وہ راہ ۱۲
اور پاؤں ہارے خوف کے تھرائے جاتے ہیں

باندھے ہو کمر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں ۱۳
ہم چلتے چلتے بات یہ سمجھائے جاتے ہیں

۱۷ سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک
ایسے میں کچھ نشان قدم پائے جاتے ہیں

۱۰۹ مفعول فاعلاتن دو بار ۱۵

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ دل کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیر نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ تھے ہم کیوں اے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کر کے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرز کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل و ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طول امل کا رستہ ممکن نہیں تہ ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایام شیب میں بھی
معلوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں ولولے کچھ ہر بار درد بنکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخمِ جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہلِ ہوس کی کشتی یک بام و دو ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کارِ فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضرِ پے خجستہ بہرِ خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل ٹٹولتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ کیا کارواں ہستی گذرا روا روی میں ۲۰
فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار وی میں

تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں
زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں

یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں ہیں تم کو
تاروں کی چھاؤں میں ہے یا پچھلے کی چاندنی میں

ہر عقدہ میں ہمارے پوشیدہ ہے کشائش
ہے موج خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں

زخموں میں خود چمن کے اور اس پہ یہ ستم ہے
رنگ پریدہ سے ہیں رہنا ہوں چاندنی میں

ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوئی
یہ امتیاز پایا آشوب آگہی میں

حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا
بندہ کا دخل بھی ہے پھر اس کی بندگی میں

رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائے راہ فروتنی میں

وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمیں کو

دو طرح کے اثر تھے اک صوت سرمدی میں
تعبیر اس کی شاید ایک واپسیں نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے ہم ساری زندگی میں
لائی حباب تک کو سیل فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو ایک دم کی زندگی میں
محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو شیر میں نے دیکھے دو دن کی زندگی میں
پہلو میں تو ہوئے دل پھر حسرتیں ہزاروں
کس بات کی کمی ہے تیری سلامتی میں
پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانئے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں
تو ایک ظل ہستی پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے دامان بیخودی میں
حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں
آنکھیں دکھا رہی ہے دن سے مجھے شب غم
آثار تیرگی کے ہیں دن کی روشنی میں

تو نے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے
پرچھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں
سجدہ کا حکم مجھ کو تو نے تو اب دیا ہے
پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں
اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

۱۱۱ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۱

صبح غم کی یہ شعاعیں نیشتر سے کم نہیں
چاک دامانِ سحر چاک جگر سے کم نہیں
حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب
قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں
زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید
ایک لمحے بھر بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں
جھک گیا ہوں ضعف سے گردش ہی قسمت میں ہی
پاؤں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں
میری از خود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں
آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر پٹکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبہ کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

بل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینہ کے گھر سے کم نہیں

انتہا رکھتا نہیں ہے گوشِ فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

منہ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوشِ یار تک
نظمؔ اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاک دامن گیر میں

باڑہ پیدا آنکھ کے سرمے کی شمشیر میں
دیکھیے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں

دم نہیں ہے صید گاہ حسن کے نخچیر میں
آرزوئیں دل میں ہیں دل ہے کسی کے تیر میں

ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی دیر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں

عشق سکھلاتا جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں

صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے باہیں گردن نخچیر میں

ابروؤں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوا نکلے اشارہ میں تو اس کے تیر میں

رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشد خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں

وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں

خرمن صبر و سکوں کی یا الٰہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہے آہ بے تاثیر میں
کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھئے

خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہے تعبیر میں
اُس کی ایک ایک بات کی دیتا ہوں میں اوسکو جواب
طول موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں

آپ سے ہو کر مخاطب محو ایسا ہو گیا
عرض مطلب کو میں بھولا لذت تقریر میں

میں اگر زنداں سے اٹھا جان لے محشر اٹھا
اے جنوں شور قیامت ہے میری زنجیر میں

کہکشاں کے حلقہ حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں
باندھ کر رکھا ہے فیل مست کو زنجیر میں

جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی
طوق آخر کو اوجھ کر رہ گیا زنجیر میں

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا
ایڑیاں رگڑیں تو ۔۔۔ صیقل ہو گئی زنجیر میں

کم نہیں رخت عروسی سے محرم کا لباس
لاکھ زیور کا مزہ ہلکی سی اک زنجیر میں

کھل پڑے گیسو تو بند ہنا اک مصیبت ہو گیا
زلف ہیکل میں کبھی اور کبھی زنجیر میں

زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہو گئے زنجیر میں

ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
اوٹھ رہی ہیں درہم و دینار اس تعمیر میں

بڑھ کے کاجل سے بھی کچھ کاجل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکان تیر میں

اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں

تجھ سے ہم کہتے نہ تھے اے نظم منہ سے اف نہ کر
ہو گیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۱۱۳ ۲۲

درد دل سے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں

آئینہ دار خیال یار ہے جوش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سو کے اوٹھنے کا ترے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی تیوری چڑھی ہوتی نہیں

جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں

کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں

وصل کی شب دل ہے میرا اور کسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں

شکوہ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں

آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں

دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز و ادا سے آرسی ہوتی نہیں

ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج اب تک روشنی ہوتی نہیں

گوشہ عزلت ہے جزر و مد عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں
یہ مرض ہستی کا اے خضر اور بے پرہیز تم
پی گئے آب بقا اب زندگی ہوتی نہیں
دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے مزہ
اہل دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں
دولت کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی
اپنی ہمت ہے کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں
شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہے ساتھ
کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی نہیں
مل کے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھکو لطف
دوستی جمتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں
آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظم رمیم
قسمت اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں
سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے
بیچ میں دیوار گردنا کسی ہوتی نہیں
آئینہ کی طرح سب سے دل کو میں رکھتا ہوں صاف
خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کہ معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
نظم اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۱۴ ۱۲

دل نہ ہوتا اگر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر چاہنے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور میں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتبان نامۂ اعمال نے دھرا دیا
ہم مکر جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر مال ان کا ہو گیا
پھیر لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاش کے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صیدِ زبوں
اے اجل تجھ سے مجھے شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے می پرستوں کے لئے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا زنگ تعلق مانع سیر و سلوک
دوڑتے گرداب میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بچتا خزاں سے جھک کے ہم کرتے سلام
سرو گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظم جب تک ہو سکے ترک تشخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

۱۱۵ ولہ ۹

حرص را خون کردن و دل را تو نگر داشتن
ایں عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلهائے جهان دانی که چیست
حرف شیرین و زبان چون موج کوثر داشتن

ای که میداری سفر در پیش و منزل جان گداز
زاد راه است ولی این بار جهان برداشتن

آنها دستی جبین عجز بر خاک نیاز
پس ترا زیبا است سر تا آسمان برداشتن

بر سر آوردن سپر در امتحان گاه وفا
هست مهر داغ رسوائی به صحفه داشتن

تا توانی دور کن زنگ هوس از خاطرت
ورنه آسان نیست چون آئینه جوهر داشتن

شبنم و شک در ره تحقیق میدانی که چیست
خار در پیراهن و نشتر به بستر داشتن

تکیه بر لطف خداوندیکه هست آمرزگار
بهتر از اندیشهٔ کردار و کیفر داشتن

دوش احمد هست معراج امیر بت شکن
پس چه حاجت اندرون کعبه و مهر داشتن

امن اس دور قمر میں فلک سیر نہیں
ہی کف افعی شب کاسۂ زنجیر نہیں

دل میں سمجھی ہوئی ہیں اپنی کہ ہم بھی کچھ ہیں
خواب وہ دیکھا ہی جسکی کوئی تعبیر نہیں

سیف قاطع ہیں نشہ کھنلئے احکام قضا
ہی زیل کی ترپ حیلہ و تدبیر نہیں

آفریں خامۂ زنغمہ و رنگیں گفتار
عندلیبوں کے ترانی ہیں یہ تحریر نہیں

باغ سبز انا دکھا ہمکو نہ ای طول امل
سمجھے بیٹھے ہیں کہ وقفہ نہیں تاخیر نہیں

دم تماری میں گزر جاتی ہی انسانکی عمر
اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

۲۴ ——— ۱۱۷

آپ کو میرے دل زار سی کچھ کام نہیں
خیر تو نہیں ستی بکرار سی کچھ کام نہیں

مشغلہ یہ بھی رہا ہست جنوں کا چند کی
اب گریباں کے کسی تار سی کچھ کام نہیں

نرم سی دور جو منہ پھیری ہوئی بیٹھی ہیں
ہیں مسیحا جنھیں بیمار سی کچھ کام نہیں

رشک نجم سحری ہی تیرا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شب تار سی کچھ کام نہیں

مجھ کو طوطی کی طرح ذوق نوا سنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سی کچھ کام نہیں

وعظ کہنے کو چلے آئی ہیں میخوار و نہیں
شیخ کو خانۂ خمار سی کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
خلش وادی پر خار سی کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہوں میں ہوا ان نسیم
مجھ کو خار سر دیوار سی کچھ کام نہیں

قلزم عشق کا پیراک نہیں میں نہ سہی
ڈوب مرنا ہی تو منجدھار سی کچھ کام نہیں

کہتا ہی راز نہاں آتش جاں سوز نہیں
اور زباں کہتی ہی اظہار سی کچھ کام نہیں

آنکھ بھر کر نگہ مست سے وہ دیکھ تو لے
پھر مجھے ساغر سرشار سے کچھ کام نہیں

تیغ کھینچے ہوئی رہتی ہے ادا ہر لحظہ
ہے ستم یہ کہ گنہگار سے کچھ کام نہیں

نفس بد کیا مجھے دنیا کی طمع دنیا ہے
تیسرے فاقہ بھی مردار سے کچھ کام نہیں

میں طلبگار تجلی نہیں موسیٰ کی طرح
آتش لالہ کہسار سے کچھ کام نہیں

مرکز صبر و سکوں زیر قدم ہے اپنے
گردش گنبد دوار سے کچھ کام نہیں

سعد و نحس اپنا ہے اپنا ہی سکون و حرکت
کوکب ثابت و سیار سے کچھ کام نہیں

اپنا منہ اشک ندامت میں نظر آتا ہے
مجھ کو آئینہ بیدار سے کچھ کام نہیں

اس کو پھرتی ہوئی دیکھا تھا الٹ جو شاید
گر گئے سر کی رفتار سے کچھ کام نہیں

اس کے جاتے ہی چلی چاندنی بھی گھر سے مرے
کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں

نیند آتی ہے تو یہ کہہ کے چلی جاتی ہے
کہ مجھے دیدۂ بیدار سے کچھ کام نہیں

موج ماری جو غم دل تو فلک تک پہنچی
اس کو لیکن اب اظہار سے کچھ کام نہیں

رہزنی میں زن دنیا کا سلیقہ دیکھو
کہ اسے مرد سکبار سے کچھ کام نہیں

کہہ دیا منکر رویت ہمیں نا فہموں نے
طالب وصل ہیں دیدار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بند پیمبر کا ہوں شیدا ای نظم
یسر ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

۱۱۸ ——— ۱۰

کچھ غبار دل شیدا کی خبر ہے کہ نہیں
نظر آئینہ پرواز دھر ہے کہ نہیں

بزم ہونے کو ہی ہم یہ خبر ہی کہ نہیں
دیکھنا رات کچھ اے شمع سحر ہی کہ نہیں

ناز کھو نگریہ ہو گیسو کو تو بڑھکر دیکھے
بل وہی ہیں وہی چھلا سی کمر ہی کہ نہیں

بیمروت ہے گلے مل کے یہ کہنا دیکھو
یوں مری سر کی قسم درد جگر ہی کہ نہیں

تجھکو نالوں سے ہو فرصت تو پوچھوں بلبل
دل لگا کے کہا نہیں تم نے کہ نہیں

ہی شب عیش کو ماتم میں فلک سوگ نشیں
دیکھ لو چاک گریباں سحر ہی کہ نہیں

رات بھر اشک بہانے کا نہیں کچھ یقیں
دیکھو دامان و گریباں مرا تر ہی کہ نہیں

تم نے تو آنکھ پھرا لی ہی ہمیں تو دیکھو
آج تک تم پہ محبت کی نظر ہی کہ نہیں

اور جو راز تھے پنہاں وہ کھلے وصل کی رات
یہ نہ معلوم ہوا ہم کو کدھر ہی کہ نہیں

ہائے افسوس نہ کہنا مرا ناحق حیدر
یار کیوں مہر و محبت میں ضرر ہی کہ نہیں

۱۴۹

خم گیسوئے دلدار کو ہم دیکھتے ہیں
کس شکنجہ میں گنہگار کو ہم دیکھتے ہیں

دم نکلنے پہ بھی آنکھ جو کھلی ہیں اپنی
بیمروت ترے انوار کو ہم دیکھتے ہیں

بپئے سیر جو کرتے ہیں انہیں لطف ہی خاک
سا قیا سبزہ و گلزار کو ہم دیکھتے ہیں

گھر بغیر اس کے جو سنسان نظر آتا ہی
کس نظر سے در و دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

ہائے کیا ہو گیا موقوف فلک کا پھرنا
ایک مدت سے شب تار کو ہم دیکھتے ہیں

اپنی قابو میں جو آجائے دل زار اپنا
پھر تری گرمی بازار کو ہم دیکھتے ہیں

صبح نو سر کے ٹپکنے ہی نہ ہو گی لیکن آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

نظم اب ترک محبت کا زمانہ ہے قریب
اور جانب نگہ یار کو ہم دیکھتے ہیں

مفاعیلن چار بار

۱۴۰ ۲۱

نفس جب تک ہے آنکھیں دید و وادید جہاں کر لیں
بندھا ہے تار یہ جب تک تماشا تتلیاں کر لیں

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
نفس کو خونفشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

کہ اپنا سخت جانی ہے گردوں فتل کے درپے
جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں

سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پھیر کا رستہ
مناسب تھا کہ پہلے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں

حسینوں کی بہار حسن ہے مہمان دو روزہ
ادائیں گرمیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں

ضعیفی میں نہیں ہمکو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ دنوں فرہاد جور آسماں کر لیں

غرض ہے کسب عرفاں مجھکو سخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اُٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کرلیں
نہ آنا ای اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائیگاں کرلیں
خضر کو فاتحہ دینی ہے گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کلتیاں کرلیں
خبر اس کی نہیں تھی دامِ زیرکا پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کرلیں
ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ ای برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کرلیں
عجب کیا گر نہیں ملتا مرے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاسِ معنیٔ خاطر نشاں کرلیں
نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کرلیں
ہماری رندی و مستی تو قابل منع کے ٹھہری
سرِ منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کرلیں
سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کرلیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کر لیں

ہمیں اس بزم میں درد محبت گر نظر آئے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کر لیں

مسیحا اٹھ لے بالیں سے ذرا پھر تم ہو اور تو ہے
ٹھہرائے درد دل اتنا کہ درد دل بیاں کر لیں

چلا میں بزم سے پھر ذکر میرا نا مناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کر لیں

ہوا یہ جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کر لیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

۲۰

۱۲۱

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کوچہ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

نہیں ہستی کو کیا تو نے مگر یار سب
لگا دیتے ہیں تہمت جیسے چھدا جیسے دھرتے ہیں

مزاج نزاکت سے آپ ہر کو نا موافق ہے
کہ گرمی سے پگھل جاتے ہیں سردی سے ٹھٹھرتے ہیں

وہ کیا جانیں جو ہیں محو لذت سے قناعت کی
کہ یہ کھے تو لے حلق سے کیونکر اترتے ہیں

نظر سرمایہ حسرت نفس سے بستن تہمت
کوئی مرنے سے ڈرتا ہوگا ہم جینے سے ڈرتے ہیں

ہری شکل سے تو پھر بھی ٹوٹی توبہ زاہد
شکست سنگ کا الزام ہم شیشہ پہ دھرتے ہیں

عنادل تو چکے ہیں خاک میں ہو کیا خبر ان کو
کہ شاخیں جو تھی یہ پھول ترتیب پر بکھرتے ہیں

یہ عادت کیا گھٹا سے سیکھ لی ہے نکتہ چینوں نے
کہ جس پر آنکھ پڑتی ہے اس کو نام دھرتے ہیں

مروت تو کہتی ہے کہ بے روی نہیں اچھی
ادا سمجھوے جاتی ہے کہ مرنے دے جو مرتے ہیں

شیشہ سے شیشہ نے تہ کو توڑ ڈالا ۱۲

تمہارے گیسوؤں کی برہمی کچھ ہم نے دیکھی ہے
بگڑنے سے یہ بنتے ہیں بکھرنے سے سنورتے ہیں

حباب اٹھ کر قرار بحر سے تا سطح آب آیا
او بکھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

اگر فقر و غنی کے سارے کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں لفظ بے معنی ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جاؤ تسلیم ہیں سیکھو
جو ہیں اہل فنا یوں سر نہ شمشیر و مصر تے ہیں

دیئے ہوں دل اپہ جب چہرے صفائی پھر کہاں تک
کہیں یہ داغ ملتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدا طبل تہی کے ہے یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوا میں بھر کے ارباب ہوس ناحق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قدم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت پیر گردوں سے گزرتے ہیں

لہ قرار بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحان کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اے نظم کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پر اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

۱۲۲ | ۱۶

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دلِ مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پر طبلۂ عنبر نکلتے ہیں
گل تر ساتھ سلگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اوٹھا ہے جوشِ خونِ لالہ و گل میں
رگِ سودا میں ہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلعِ ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شبِ غم اک بلائے بد ہے تاری میں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ سے بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہی نہیں یہ لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں سے تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو وہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھ کو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہے اس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل میں جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نا پاتو حسینوں کے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور لٹتے گلا میرا دباتی ہے
مرے نالے مجھی پر کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جاتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیرِ نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہی یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں گوشش ہی کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

کنواں کھودیں جو سر سے اس میں بھی پتھر نکلتے ہیں
متاعِ صبر و ہوش اے نظم تو بیٹھا تو ہے لیکر
خبر بھی ہے کہ اس رستہ سے غارتگر نکلتے ہیں

۲۳

ثنائے ساقیِ کوثر میں شعر تر نکلتے ہیں
زمینِ شعر سے بھی چشمۂ کوثر نکلتے ہیں
غنیمت ہے نفس کے ساتھ جو اخگر نکلتے ہیں
یہ ہیں ارمان اپنے دل کے رہ رہ کر نکلتے ہیں
ازل میں بزمِ ماتم تھی مہ و خورشید سے پوچھو
کہ جب سے یہ نکلتے ہیں برہنہ سر نکلتے ہیں
زباں سے میری گر شکوہ نہیں نکلا نہیں نکلا
اک آواز شکستِ رنگ سے دفتر نکلتے ہیں
غبار آئے کسی کے دل میں تجھ سے کیا قیامت ہے
سنا ہوگا کہ اکثر گرد سے لشکر نکلتے ہیں
جہاں کو آئینہ سمجھیں طلسمِ قدرتِ حق کا
تو اک ذرہ سے سو بت خانۂ آذر نکلتے ہیں
حیرت سے نقصان و کمالِ ماہ کو دیکھو

۱ ۔ ۲ ۔ شکوہ و ذرہ کے ۱۲

جو پہلے سر پہ پڑتے تھے وہ دبکر نکلتے ہیں
ہوائے دیدہ اڑتی ہے مخمشہ ہو کہ کوثر ہو
نہ ہیں میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں
صدائے چنگ سے مجھکو یہی آواز آتی ہے
یہ کہتا ہے کوئی پردہ سے ہم باہر نکلتے ہیں
گدائے بے نوا کی ایک ٹھوکر سے جو گر اٹھے
ابھی لڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں
اٹھائے ہیں جہاں میں داغ جوہر گر نہ بھولونگا
یہ تیرے چند درہم اے فلک مجھ پر نکلتے ہیں
گذر جاتے ہیں یوں روز سیہ ارباب ہمت پر
ستارے جس طرح بادل میں چھپ چھپکر نکلتے ہیں
نشان سوز غم باقی ہے میری خاک میں اب تک
دل پر داغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں
کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہو کر
ابھی اس گنبد بے در میں صدہا در نکلتے ہیں
دل بے آرزو جب سے ملا ہے نظم حیراں ہوں
کسی کے منہ سے حرف آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے مجھی پر حوصلے دل کے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں ہو جائیں گی برہم
یہ ترکان قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریق عشق میں ہر ہر قدم ہے کام اژدر میں
وہاں مارے کے چھالے ہیں جو تلوؤں کے چھالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجے
حباب بحر دست موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سے لیکر عرش تک سب کچھ بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زمیں پر کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوش ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں

تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں اب تک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں

الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سے جو ساغر بنے ان میں بھی چھالے ہیں

ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں

قلم کی طرح سجدے ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں

کرم سے اس کے ہیں سامان کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادوں کے جھالے ہیں

وہ ناداں ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضہ میں ہیں کل اس کے حوالے ہیں

وہ اب کے سال ہے بوتل کا گاگر اوڑتی ہیں کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اوچھالے ہیں

نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے ظاہر آرائی

کفن گاڑھے کا اور تابوت کے اوپر روشالے ہیں
جہاں تو جلوہ گر ہو ہے تم ضبط فغاں کرنا
نہ ہے آتا ہے ان پر رحم جو دل کو سنبھالے ہیں
جو پہلے جا چکے اس بزم میں ان کو تو کیا روؤں
پڑے ہے جاتے ہیں وہ آگے جو میرے ساتھ والے ہیں

۱۲۵

ہوئی یہ کثرت مشق و نما فصل بہاری میں
کہ بلبل ڈھونڈتی ہے نکہت گل کی سواری میں
مجھے فرقت کی شب یہ سوچ ہے اختر شماری میں
تمامی کہکشاں میں ہے کہ دندانے ہیں آری میں
گریباں پھاڑیے گل کی طرح فصل بہاری میں
کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں
حباب بحر ہیں ہم یا سراب دشت کچھ ہیں تو
کہ بوئے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں
مرے حصے میں جام جم نہ کیوں اس بزم میں آئے
کہ میں بھی تو ہوں کیا کم زمانہ بادہ خواری میں
جنوں تکیں سے بہتر ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا

تغیر آب راکد کی طرح سے آب [illegible] میں
اوٹھانے کو درو گوہر کے میں ہر اک سے جھکتا ہوں
مجھے کان جواہر مل گئی ہے خاکساری میں
اجل نے تو مجھے چھوڑا کہ اک صید زبوں یہ ہے
یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شہر ساری میں
پشیماں ہونگا تجھکو شاہ خوباں کیوں کہا میں نے
نہ کی پھر بات ہی مجھ سے غرور شہر یاری میں
ٹھہرا اے سیل گریہ ہی جو عکس یار کی طالب
صفائی کی ہی صورت غیر ممکن بیقراری میں
غریب آزار کو فرعون اہل دل سمجھتے ہیں
وہ تخت عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں
ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں اے حیدر
خدا جانے کہوں کیا عالم بے اختیاری میں

۲۶

ابھی تک بحث امکان و کان جاری ہے عالم میں
فنا اک دم میں ہی سارا جہاں موجود اک جم میں

یعنی فیضان وجود ہر آن میں نہ ہو تا ہی تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانانِ چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے
جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دستِ شبنم میں

مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں اے اجل اُنکا
چھپا رکھی تھی میں نے آرزوئیں جان پر غم میں

کرونگی کسی سے مفت سب ممنونِ منت ہوں
جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمۂ احسان حاتم میں

سلیمان جہاں سمجھوں نہ کیوں اہلِ مروت کو
تبسم ہے لبِ رنگیں پہ جیسے نقشِ خاتم میں

حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہلِ سعادت کی
نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامانِ مریم میں

فریبِ اہلِ دنیا سے نہیں مردِ خدا ڈرتے
حقیقت حیدرِ والا کی کیا چشم ضیغم میں

مجھے اس عالمِ افتادگی میں رشک آتا ہے
کہاں سے آگئی یہ طاقتِ پرواز شبنم میں

عجب ہے بزمِ مے میں سیر کرنا سارے عالم کی
کوئی قطرہ شرابِ عشق کا تھا ساغرِ جم میں

بقیہ اگا سلسلہ ذرا موقوف ہو تو دنیا تاریک ہو جائیگی کل یوم ہوئی شان ۱۲

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملا پ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

۱۲۷ — رمل مفاعیل مفاعیل مفاعیل — ۲۰

گمراہ کیا نفس نے دنیائے دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہے اس بے وطنی میں

تنہا نہ ملا گوشۂ مرقد بھی کسی کو
سنتے ہیں کہ کشتی ہوئی درویش و غنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[1] کے پیکاں ہیں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرتا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیا یہ پس و پیش ہے امر شدنی میں

آ ہے تو کسی طرح سے اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہر بجلی کنی میں

جس نخل کو یہ سیل فنا دیتی ہے پانی
مصروف اوسی نخل کی ہے بیخ کنی میں

لازم ہے کہ دامان و گریباں میں رہے چاک
ہے موسم گل لطف ہے گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سے تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہے بڑا فرق کریم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہے زاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہے پھرتا ہے جو توسن
شاید دل بیتاب ہے برچھی کی انی میں

کب بات کی جس سے وہ ہوا کشتۂ حسرت
کیا زہر گھلا ہے تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نور و کی اٹھی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہے چمن رنگ عقیق یمنی میں

کہنے میں نہ ہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہے گردن کش و گردن زدنی میں

[1] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ۱۲

ہے نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی ہیں
کچھ دل کی درستی ہے تو بس دل شکنی ہیں

ہرگز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات
کچھ کام نکلتا ہے تو شیریں سخنی ہیں

ساتھ آئی ہے کچھ گرد کدورت جو وطن سے
پروا مجھے مرقد کی نہیں بیوطنی ہیں

چلتے ہیں وہ اب راہ سماری پہ قلم کے
جو شہرہ آفاق تھی شمشیر زنی ہیں

مل جائیگا محشر میں دل اس مردہ جو دی
عادت یہ ہمیشہ کی ہے اس نامشدنی ہیں

کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
ملتا ہے مزہ آپ کو پیماں شکنی ہیں

کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دشکنی ہیں

۱۲۸ ——— ۲۱

اندیشہ ہے رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہے سفر میں

آنکھیں مری یوں محو تماشا ہیں دو توں
وہ داغ تھے گویا پر طاؤس نظر میں

کہتے ہیں غلط تیر لگایا نہیں تو نے
خود میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں

افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں

پر خوف یہ منزل ہے سبکبار گذر جا
برسوں سے یہ آتی ہے صدا راہ گذر میں

ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کے پکارو
در ہے مگر آواز نہیں حلقہ در میں

دیتا ہے وہ نعمت تو اٹھائے نہیں اٹھتی
پھولوں سے لچک آ گئی شاخ گل تر میں

گر اہل جہاں داغ اٹھائے نہیں جاتے
پھر کس لئے پیدا ہوئے اس دہر میں

بچپن سے جوانی ہے جوانی سے بڑھاپا
ہے خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

کیوں نالۂ یار آنکھوں سے اپنی نہ لگا
[illegible] ہو جسے باندھ کے جبریل کے پر میں

مست مے عرفاں کو کسی طرح سنبھالے
ایسا بھی ہے ہشیار کوئی اہل خبر میں

اس راہ میں دم نکلے تو کافور سے کیا کام
کر دینا مجھے دفن اسی گرد سفر میں

کسی طرح عنادل کے گلے میں اتر آئے
نغمے تھے نہاں پردۂ برگ گل تر میں

یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے
غلطاں بلوریں ہیں ہر اک ساق شجر میں

منظور اگر ہو دل مردہ کو جلانا
ہے جعفر عیسیٰ نفس باد سحر میں

حسرت ہے کبھی عمر گذشتہ کو کریں یاد
مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں

گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمت خالق
جس طرح سے جوئی کا ہو گلہ تنگ شکر میں

نکلا نہ کسی سوزن مژگاں سے مرا کام
برسوں ہے [illegible] رہی اک پھانس جگر میں

کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقت تبسم
ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقد گہر میں

ہے اس کی ادا قاتل عالم دم رفتار
تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنہیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میں نہ رباعی عمر میں

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں دست طلب کا ڈر نہیں
اپنا ہے اس [illegible] آشیاں نخل جو بار ور نہیں

سنتے ہو اہلِ قافلہ میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں اس سے کہیں مفر نہیں
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشان نہ تھا
آخر کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

صبحِ ازل سے تا ابد قصہ نہ ہوگا یہ تمام
جورِ فلک کی داستاں ایسی بھی مختصر نہیں

برگِ خزاں رسیدہ ہوں چھیڑ نہ مجھکو اے نسیم
ذوقِ فغاں کا ہے مجھے شکوۂ ابر تر نہیں

منکرِ حشر ہے کدھر دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی جو خبر نہ دے ایسی کوئی سحر نہیں

شبنم و گل کو دیکھکر وجد نہ آئے کسطرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرفِ کلہ ہیں دے شکن اس کو یہ دردِ سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کئے تو کیا

حیف ہے خانماں خراب دل میں کسی کے گھر نہیں
نالہ کشی رقیب سے میری طرح محال ہے
دل نہیں حوصلہ نہیں زہرہ نہیں جگر نہیں
شاطر پیر آسماں واہ ری تیری دستبرد
خسرو و کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں
شان کریم کی یہ ہے ہاں سے ہو پیشتر عطا
لطف عطا کا کیا ہو جب ہاں سے ہو پیشتر نہیں
لاکھ وہ بیرخی کرے لاکھ وہ کج روی کرے
کچھ تو ملال اس کا ہو دل کو مرے مگر نہیں
سن کے برا نہ مانئے سچ کو نہ جھوٹ جانئے
ذکر ہے کچھ گلہ نہیں بات ہے نیشتر نہیں

حرف واؤ

۱۲ مفاعیلن چار بار

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو
ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو
دکھائے جاروانی تو سر عمر رواں مجھ کو

ہلال برق سر رکھ ہم رکاب و ہم عناں مجھ کو
بنایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو

اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو
دم صبح ازل سے میں نوا سنجوں میں ہوں تیرے

[illegible] بلبل سدرہ نے انداز فغاں مجھ کو
[illegible] کیا معلوم کب سوئے وہ کب جاگے

[illegible] سو اس لئے کہنی پڑی پھر داستاں مجھ کو
[illegible] بیم زار کو سپینکا

[illegible] سیل تھی بانگ درائے کارواں مجھ کو
[illegible] خاک ہو کر بھی نہ جائے گی

[illegible] لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھ کو
[illegible] تیرے واسطے پالے

[illegible] اندہ ملا ان منزلوں میں آسماں مجھ کو
[illegible] جلا دے ہوں وہ پروانہ

[illegible] آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھ کو
[illegible] آیا ناتواں ہو کر

[illegible] سے حسرت دید ارلے آئی کہاں مجھ کو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کس طرح جاؤں
لہو اور دل آپ سے باہر بہا کر بیڑیاں مجھ کو
غبار راہ سے اے نظم یہ آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھ کو

۱۳

نہیں پروا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد بن جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہو شرارت کو
گرہ میں باندھیے اب مثل انگشت داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے بادِ بہاری میں
اوڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باراں رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں دشمنوں کو

حسینوں کو کیا گر دیدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو

کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس پر تغافل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بے مروت کو

پلک جھپکاتے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کرے صانع کی قدرت کو

بیاباں ہوا بھی زنداں میں پیدا ہے یہ ایذا
جھٹک دوں میں اگر دامن سے اپنے گرد کلفت کو

نہ تھی اے نظم تدبیر اور کچھ دل کے بہلنے کا
گریباں سے نہ الجھاتا [illegible]

۱۳۲

عجب شوریست از حرف دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو

خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو

وفور مستی من کرد برهم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشه و پیمانه در پهلو

نمی دانم چه افسون کرد بر من نشر هستی
نگاهم محو غیر و جلوه جانانه در پهلو

خوشا عرفان اگر از ما سوا پهلو تهی کردی
به بین گنج خالی نیست این ویرانه در پهلو

زدم بر شمع بالین آستینی در شب هجران
دلم می سوخت بر بیتابی پروانه در پهلو

بشمع قامت آن ترک حسن فتنه زا باشد
که خود تیغش بلرزد چون پر پروانه در پهلو

تنم را زار کردست آنچنان سودای زلف او
نمایان استخوانها گشته مثل شانه در پهلو

بشر در انقلاب دهر گوئی در غلطان است
بهر پهلو که غلطد دار و آب و دانه در پهلو

همانا چارهٔ داغ دل از مرهم نمی آید
که دارم پنبه بر پهلو و آتش خانه در پهلو

دلم محو طلسمات جهان من طالب صانع

ہوائے کعبہ و سر دارم و بت خانہ در پہلو
خوشا وقتِ قدح خواری کہ گردش می کند باہم
بنرش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو
چہ طور از شکر بتہا کہ بنوشتم بادۂ آخر
کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو
چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر
کہ دل سوزد بلبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

۱۳۳

عبث ہے ناز استغنا پہ گل کی کیا خبر کیا ہو
خدا معلوم یہ سامان کیا ہو جائے سر کیا ہو
یہ آہِ بے اثر کیا ہو یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو
[illegible] یا رب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو
جہاں انسان کھو جائے [illegible] محفل میں
رسائی کس طرح ہو دل کیونکر ہو گذر کیا ہو
نہ پوچھوں گا یہ بھی جام ہے زہر یا امرت
تمہارے ہاتھ سے اندیشۂ نفع و ضرر کیا ہو
مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنین ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو
شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو
رہا کرتی ہے یہ حیرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اوسے بندہ کا ڈر کیا ہو
کہا میں نے کہ نظم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو
کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو
کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو
کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو
کہا میں نے قدم بھر پر ہے وہ صورت دکھا آؤ
کیا منھ پھیر کر اتنا کسی کو درد سر کیا ہو
کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پہ اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ تو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جان اوس نے گھٹ گھٹ کر
کہا مر جائے چپکی سے تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

۱۲۴ ۱۴

مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سر گرم فغاں کیوں ہو
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچ اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
ملیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا نہ ہو وہ میہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آجائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سمجھے کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہا
تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے
فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنی ناصح
اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا نرم خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے
تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ
حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا
تلون گر نہ ہو تو تیوریوں میں ہو چپاں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدر تھا مقدر میں
رکے ہیں جب وہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دست یاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو

کیا ہے صاف دلوں کی جو دوربینوں کو
تو ساتھ پردوں میں دیکھا کئے حسینوں کو

ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو

گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو

چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو

جہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسمان سے بدلوں میں ان زمینوں کو

ہوس رہی نہیں دولت کی خاکساری میں
کہ اس زمین نے سر کا دیا دفینوں کو

بتا دیا ہے ہمیں ساقی ازل نے یہی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو

نہ پوچھ بادِ صبا سو ہم خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر اے نظم
بھلائیں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

۱۳۶ ۱۸

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو
تو رنگ دیا ترے عارض نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کو
صفیں اُلٹ گئیں الٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کسی کو کسی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
قبائے یار سے کس طرح دیتے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں سے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پرداز آستینوں کو
نشاں بن گئے ہیں ناز کی سے ہاتھوں

قبا جو پہنی ہے چنوا کے آستینوں کو
غرض کسی نہ کسی طرح چٹکیاں لینا
کوئی یہ جانے کہ چنتے ہیں آستینوں کو

بہار دیدۂ خونبار کا ہوں میں مفتوں
کہ شاخ گل سے ہے تشبیہ آستینوں کو

نہ رکھا تار گریباں میں نہ دامن میں
الٹ کے پنجۂ وحشت نے آستینوں کو

رہا جنوں میں بھی مجھ کو لحاظ پردہ دری
دیا ہے چاک گریباں کا آستینوں کو

ہوا وج فقر پہ زاہد جہاں سے کھینچ کے ہاتھ
بنا لیا پر پرواز آستینوں کو

جو بزم میں ہو تماشائے رقص اوسے منظور
نکالے جامۂ فانوس آستینوں کو

کنار جو نظر آتا ہے پنجۂ مرجاں
چنا ہے مل کے حنا اس نے آستینوں کو

خبر ہی سے سبب کسر شان ہے چین جبیں
شکن سے جیسے ہو کوتاہی آستینوں کو

بنایا اشکوں نے دامن کو دامن دریا
بجا ہے موج سے تشبیہ آستینوں کو
کمال حسن ہے دست ہوس کی کوتاہی
شکن نہ زیب دے کس طرح آستینوں کو
ہر ایک شعر میں چیدہ ہیں مصرع اے حیدر
چنا ہے شاہد مضموں کی آستینوں کو

۱۴۷ ——— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات ——— ۱۵

اتنا تو میں ضرور کہوں گا خفا نہو
بے مثل حسن میں ہو اگر بے وفا نہو
آئینہ کہہ رہا ہے کہ ہو محو ناز تو
سمجھا رہی ہے شرم کوئی دیکھتا نہو
ہستی فقط تصور ہستی کا نام ہے
زندہ نہیں ہے وہ جسے یاد خدا نہو
وہ آدمی نہیں ہے جو خالی ہو درد سے
اس دل کو دل نہ جانیے جو مبتلا نہو
منکر ہر ایک شئے سے اسی کا ظہور ہے
اس کا علاج کیا جو تجھے سوجھتا نہو
وہ بھی ہیں لوگ حشر میں جنکو ہے شوق دید
ڈرتا ہوں میں خدا کرے کہ میں سامنا نہو
اغیار تو ہوں ساقی ہوش شریک دور
پھروں کھڑے رہیں تو ہماری صلا نہو
بھولا ہوا ہے حیف عہد الست کو
ممکن ہے یہ کہ مر کے بھی وعدہ وفا نہو
ہے زیست وہ پہاڑ جو کاٹے نہ کٹ سکے
اس راہ میں اگر فرس باد پا نہ ہو
دریائے بے کنار ہو اور اک میں ناؤ ہو
خبر دیدۂ احباب کوئی آشنا نہو

اس دشت سے گزر تو سبکبار ہی گزر
اس طرح جائیے کہ کہیں نقشِ پا نہ ہو

پھیلاؤ اتنا پاؤں نہ دنیا کو دیکھ کر
گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہ ہو

کیا ہونگے اوٹ پھولونکو وہ گلبدن نہیں
کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہ ہو

مشکل پسند میری طبیعت ہے شیوہ میں
جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہ ہو

حیراں ہوں میں دعا ہے کہ یہ کوسنا ہے نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا برا ہو

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۱۲۸ ۱۲۹

مجھ کو سمجھو یادگارِ رفتگانِ لکھنؤ
ہوں قدِ آدم غبارِ کاروانِ لکھنؤ

خونِ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنؤ
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنؤ

گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنؤ

میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرزِ فغانِ لکھنؤ

ڈھونڈھتا ہے اب کسی لے کر چراغِ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ مجمع اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

پہلے تھا اہلِ زبان کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغ اردو کو فسانِ لکھنؤ

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو اتنوں میں ہوتا نوحہ خواں لکھنؤ

یہ غبار ناتواں خاکستر پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمع دودمانِ لکھنؤ

چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفل رضیع
سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ

عہد پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں ہم نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ

گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ

بوئے اُنس آتی ہے حیدر خاک مٹیا برج سے

جمع ہیں اک جا وطن آوارگانِ لکھنؤ

۱۳۹ ۱۶

فغاں از آہ و زاری دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دل من سوخت ناگاہ پرتوے از شمع رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریۂ مستانہ در پہلو
وفورِ مستی من کرد برہم وضع محفل را
درآغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما ہوا پہلوتہی کردی
بہ بیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بے تابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد

که خود تیغش بلرزد چون پر پروانه در پهلو
تنم را زار کردست آنچنان سودای زلف او
نمایان استخوان ها گشته مثل شانه در پهلو
بشر در انقلاب دهر گوئی در غلطان است
بهر پهلو که غلطد دارد آب و دانه در پهلو
همانا چاره داغ دل از مرهم نمی آید
که دارم مینه بر پهلو و آتش خانه در پهلو
مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم
ز راه شوق مسجد می کشد میخانه در پهلو
دلم محو طلسمات جهان من طالب صانع
هوای کعبه در سر دارم و بتخانه در پهلو
خوشا وقت قدح خواری که گردش میکند باهم
بنزمش ساغر و هم سبحه صد دانه در پهلو
چه طومار شکایتها که بنوشتم باو آخر
که هر یک لفظ دارد معنی بیگانه در پهلو
چو گل با خار منی جائے فریاد است اے حیدر
که دل سوزد لبش پر خنده و بیگانه در پهلو

۱۴۹ —— حرف ہ —— ۱۳

کس لئے چھپتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی ٹھوکر کا نشاں
مٹ گئے راہرو و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اوسی صحرا میں اکیلا ہوں میں
رہتے جس دشت میں ہیں خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
باخدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا
کھینچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے
ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو
کانپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو
بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا[1] و عقبیٰ سے غرض
تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سننا نہ کسی جانے والے کی کبھی
کان میں پھونک دیے ہیں یہ لہر دونوں ساتھ

اثر سیاں آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے
دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظیم
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

---

[1] دنیا میں الف مقصورہ ہے بعد الالف کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱

یوں تو نہ تری جسم نہ ہیں زینہار ہاتھ
دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ
شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترکِ سعی سے افسوس تو یہ ہے
ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موجِ بحر
یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

درپے ہیں میرے قتل کے احباب اور میں
خوش ہوں کہ میرے خون سے رنگیں ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح
کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
پتھر سے سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھالنا کہ ہے لبریز جامِ مے
لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مطرب سے پوچھ مسئلۂ جبر و اختیار
کیا تال سم پہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں اور ہوں علائق دنیا کے دام میں
میرا نہ ایک ہاتھ نہ اس کے ہزار ہاتھ

اے نظم وصل میں بھی رہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

۱۴۲ — فاعیل فاعلات فاعیل فاعلات — ۱۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے
کچھ حوصلے ابھی ہیں اسی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہاں کے
جنگل میں بیرن کے گئے خاک چھان کے

لایعقلانہ طرز ہیں سارے جہان کے
کیسی شراب دور میں ہے آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب ہے جہان کے
نالے پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صف محشر میں آن کے
اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہاں کو ڈبو دے یہ طفل اشک
مٹھی میں ہیں یہ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا
جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

یا زیب تک پہنچ گئے لو حلقہائے زلف
قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے مغتنم کہ ہجر میں رونا ہی آگیا
آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اشک مہمان کے

بچھا چھوڑا اچکا تھا میں دل اٹھا کے ہاتھ
دل ہاتھ دھو کے پیچھے پڑا میری جان کے

کوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوج گل قریب
کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرف تلخ
اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

ماما تجھے نہ عالم اجسام میں کہیں
چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو
گویا حجاب قدس پہ پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی بار وقار کا
ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ
دیکھے جہاں میں لوگ نہ اس آن بان کے

بہتر ہے تو بھی اے نفس واپسیں نہ آ
کب تک اوٹھاؤں ضعف میں صدمے مکان کے

مسوی میں چشم غول کو سمجھا چراغ بام
مارا پڑا میں دہیاں میں تیرے مکان کے

اے دود آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد
جھنڈی پر چڑھ گئی ہے تھی نشان کے

اے نظم بزم عیش پہ مقتل کا ہے گماں
چھیڑیاں پہ چل رہی ہیں کہ فقرہ اذان کے

۱۴۳ ——— ۲۱

روکے ہوئے ہے جن کے حصار آسمان مجھے
ذوق وصال کھینچ کے لایا کہاں مجھے

لے تو چلا ہے تو سن عمر رواں مجھے
اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے
اس کے عوض اٹھانا ہے بار گراں مجھے

ہوں قلزم فنا میں سہارے یہ سانس کے
دیکھے اے حباب جو ملا بادباں مجھے

جب سے کنارہ میں نے کیا سرو کی طرح
یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہر خموشاں کی خامشی
کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلق دنیا ہے سد راہ
اے موت توڑتا ہے یہ بند گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی
اس کا علاج کیا کہ ہے ذوق فغاں مجھے

کہتا ہے اوٹھتے بیٹھتے دامانوں کا غبار
کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا
اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

دیکھا شعار اہل ورع سمعہ و ریا
آئی پسند صحبت دیر مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا
وقت عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبح الست کے
پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی
لہرا رہی ہے موج ترنگ کماں مجھے

سر میں سفیدی آگئی یا نہ پھر بھی ہوش
پچھلے کی چاندنی میں ہے خواب گراں مجھے

کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم
رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے باد خزاں مجھے

آفات دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر
دی مرگ ناگہاں نے نوید اماں مجھے

زحمت بغیر خلق میں راحت نہیں نصیب
تنکے چنے ہیں جب تو ملا آشیاں مجھے

خواہش کی پیروی ہے جہنم کا سامنا
گلخن میں بجلی ہوس گلستاں مجھے

باہم جو اتحاد ہے پاتا نہیں رقیب
اس کے وہاں اوسنے تو میری یہاں مجھے

اے نظم کوہ و دشت میں ٹکرا رہا ہوں اب
بانگ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۴۳ — ۲۲

گذری نسیم باغ کو شاداں کئے ہوئے
رہ جاتے ہیں جہان میں احساں کئے ہوئے

رخ ہے عدم کا عمر گریزاں کئے ہوئے
ہستی کو گرد جنبش داماں کئے ہوئے

تھی صبح ظلمت شب غم سے ڈری ہوئی
آئی چراغ کوتہ داماں کئے ہوئے

کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا
اب عناں گسستہ کو جولاں کئے ہوئے

آیا تھا جوش لالہ و گل کی طرح شباب
جاتا ہے خون حسرت و ارماں کئے ہوئے

دشمن سے رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دئے
بھولا نہیں میں دوست کے احساں کئے ہوئے

میدان بادپرس میں دیوانگان عشق
بیٹھے ہیں چاک دفتر عصیاں کئے ہوئے

دو چار اشک نذر کو لایا ہوں اے کریم
جو خون آرزو میں ہیں غلطاں کیے ہوئے

شبنم اوڑی ہے پھونک کے افسون اہتزاز
تسخیر آفتاب کا ساماں کیے ہوئے

ہم آپ سب شب یک تھی بزم الست میں
کچھ یاد بھی ہیں وعدہ و پیماں کیے ہوئے

آزادہ مشربی کا جنہیں کچھ نہیں خیال
یہ لوگ زندگی کو ہے زنداں کیے ہوئے

بیباکیوں پہ فخر ہے سفاکیوں پہ ناز
منہ دیکھتے ہیں تیغ کو عریاں کیے ہوئے

قامت میں اس کے اور قیامت میں فرق ہے
مصرع ہیں دونوں دست و گریباں کیے ہوئے

یاران رفتہ سوتے ہو کس کنج تار میں
بزم نشاط عیش کو ویراں کیے ہوئے

راہ طلب میں بچ کے ہوا و ہوس سے چل
ہاں سرکشوں کو تابع فرماں کیے ہوئے

پیری نے ہی شکست نگہ نے دیا جواب
جاتی ہے بیرخی صف مژگاں کیے ہوئے

امید وہاں کرتی ہے طاؤس کا شکار
رنگ پریدہ کو چمنستاں کیے ہوئے

ساقی نوید مژدہ کہ آئی ہے فصل گل
بدلی میں آفتاب کو پنہاں کیے ہوئے

گلی چمن میں نالۂ عل مشکلیں ہیں سب
چٹکی کلی کہ عقدے ہیں آساں کیے ہوئے

بیاد دامن نسیم میں ہے جانفزا ہوا
بجھتے نہیں چراغ فروزاں کیے ہوئے

موج نسیم تیز ہے گو فونکی ہے نہاں
بال پری کا رنگ نمایاں کیے ہوئے

رک لالہ زار خون سر کوہکن کا ہے
دامن میں مستوں کے چراغاں کیے ہوئے

اے نظم شاعری نہ سہی ساحری تو ہے
ہیں سب کا اعتراف سخنداں کیے ہوئے

اوتنا ہی شکر نعمت و راحت میں چاہیے
جتنی شراب محفل عشرت میں چاہیے
اس بات کا خیال محبت میں چاہیے
برگ حنا و رنگ ہے اس سے ہی پائے مال
میکش ہو رند مست ہو شاہد پرست ہو
نکلا جو کم قدس رگ جاں کے منتقل
پہلو سے دل نکال کے ہاتھوں پہ اپنے رکھ
خدمت کا عمر بھر کی صلا اے متاع دہر
اے اضطراب دل نہ لحد کو تو یوں ہلا
ہستی کے ساتھ روگ ہیں لاکھوں لگے ہوئے
حسرت سہی امید سہی آرزو سہی
اہل وطن نہیں سہی یاد وطن سہی
آنکھوں میں پڑ کے کہتی ہے یہ خاک رہگزر
اپنی ہی جب نظر میں سماتے نہیں ہیں ہم
احباب پر نہ لاش اٹھانے کا بار ہو
طعنے دئے تو گالیاں دینے میں شرم کیا

جتنا کہ صبر رنج و مصیبت میں چاہیے
اوتنا ہی خون دل غم فرقت میں چاہیے
یعنے جو چاہیے تو حقیقت میں چاہیے
بس ایک رنگ معنی و صورت میں چاہیے
ہاں سمعو ریا نہ عبادت میں چاہیے
ایسی طناب پردۂ قدرت میں چاہیے
ایسا حضور قلب عبادت میں چاہیے
کیا دوسری گز کفن مجھے خلعت میں چاہیے
کچھ فرق گاہوارہ و تربت میں چاہیے
جو چاہیے نہیں وہ اس آفت میں چاہیے
مونس کوئی تو عالم وحشت میں چاہیے
کوئی تو ساتھ وادی غربت میں چاہیے
سرمہ ضرور دیدۂ عبرت میں چاہیے
اب کون سی ہے بات جو ذلت میں چاہیے
میری لحد بھی گوشۂ عزلت میں چاہیے
کچھ تو بھلا نمک بھی جراحت میں چاہیے

یوسف اگرچہ دل ہے میں دے دو کا مفت ہی
انکار اور آپ سے قیمت میں چاہیئے

منزل جو ہے پہاڑ تو اے نظم غم نہ کر
تیزی قدم کی قطع مسافت میں چاہیئے

۱۴۵ — ۱۰

پہلو میں دل ہے آرزوئے یار کے لئے
آنکھیں ملی ہیں حسرت دیدار کے لئے

طاعت پہ تجھ کو ناز ہے رحمت پہ مجھ کو ناز
زاہد یہ حصہ بس ہے ہمارے کے لئے

سب ہوئے تن کھڑے ہیں قیامت کے خوف سے
شاہد ہے بال بال گنہ گار کے لئے

کانٹوں نے پیرہن کو تبرک بنا لیا
ایک ایک تار لے لیا دستار کے لئے

اب کے عجب نہیں ہے ہوئے بہار سے
اوتریں مسیح نرگس بیمار کے لئے

دیکھا نگاہ بھر کے جو آنکھوں نے یار کو
دو جام بھر کے شربت دیدار کے لئے

لالچ ہے مال و زر کا بری طرح کا مرض
دیتے ہیں جان شربت دینار کے لئے

پہلو میں اندنوں ہے غم و یاس کا ہجوم
دل کے لئے جگہ ہے نہ دلدار کے لئے

یاد آتی ہے ہوا تری کوچہ کی خلد میں
دل لوٹتا ہے سایہ دیوار کے لئے

حیدر کو سلسلہ تھا نہ ان گیسوؤں سے کچھ
لیکن الجھ پڑے ہیں وہ بیکار کے لئے

۱۴۶ — ۱۳

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے
جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

میکش کے حق میں زہر ہے تمیز نیک و بد
رحمت خدا کی ان کو جو سرشار ہو گئے

بسمل دل و جگر کو نہ دیکھا تھا اس طرح
نالے تو آج کھینچتے ہی تلوار ہو گئے

قہر و عتاب کی بھی نگاہیں تھیں دلنشیں
پیوست تیر ناوک سوفار ہو گئے

اس رہ گذر میں دام نہاں بر دام تھا
آزاد بھی ہوئے کہ گرفتار ہو گئے

بجلی کی طرح کرتے ہیں راہ صراط طے
اس پار سے تڑپ کے ہم اوس پار ہو گئے

دانتوں کے ساتھ دیکھے ہیں تارے بھی ٹوٹتے
جو دن تھے زندگی کے شب تار ہو گئے

مومن پھرتے رہ گئے پھیرتے ہیں سبحہ کے
کافر اسیر حلقۂ زنار ہو گئے

عبرت سے دیکھ گور غریباں کے ڈھیر کو
کتنے ہی قصر تن تھے جو مسمار ہو گئے

ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ
ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

مرنے کی آرزو ہی شب غم میں رہ گئی
حیلے جو موت کے تھے وہ بیکار ہو گئے

مرکز کی طرح جب کوئی ثابت قدم رہا
چکر نصیب کے خط پرکار ہو گئے

بدخوابیوں میں نظم شب عمر کٹ گئی
غافل کبھی رہے کبھی ہشیار ہو گئے

۴۷

آخر ہوا شباب وہ صحبت نہیں رہی
لو صبح ہو گئی شب عشرت نہیں رہی

پچھلے کی چاندنی ہیں یہ سر کے سفید بال
جاڑوں کی دھوپ میں وہ حرارت نہیں رہی

سیماب گشتہ ہو گیا کافور شیب سے
بیچین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی

سکتہ میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

دلکو سنبھالتے تھے پہلے ہمیں اور اب
خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں
مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

تلووں کو شوق خار مغیلاں نہیں رہا
سر میں ہوائے وادی وحشت نہیں رہی

وہ انتظار وصل کی شب کا گذر گیا
وہ بیقراری شب فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر
مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی بہار
لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست
لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پر آب و تاب
لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی

گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا
باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی

اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار
وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا
جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

بالیں پہ آکے ناز سے کہتی ہے یہ اجل
کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بولی یہ روح قالب خاکی کو چھوڑ کر
دامن پہ گرد وادی غربت نہیں رہی

ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے
اب دو کمان کی مسافت نہیں رہی

خلوت جو چاہتا ہے تو حیدر خودی کو چھوڑ
خلوت میں ما و من ہو تو خلوت نہیں رہی

۱۴۸

میں دیکھتا ہی رہ گیا وہ چال چل گئے
پہلو سے دل نکال کے تلووں سے مل گئے

حسرت سے دیکھنے پہ وہ کیسا بدل گئے
آخر نہ قتل کرکے بھی تیوری سے بل گئے

ناوک بھی تیری کرتے ہیں بے اعتنائیاں
آئے ادھر سے اور ادھر سے نکل گئے

یکساں ہے اب نشیب و فراز جہاں ہمیں
جاتا رہا شباب تو سانچہ میں ڈھل گئے

منزل کا شوق اپنے لئے خضر راہ تھا
تھک تھک کے لاکھ بار گرے پھر سنبھل گئے

سیل فنا میں دونوں کے دونوں تھے بے ثبات
آکر حباب چرخ سے ٹوپی بدل گئے

پیدا اصلاح برگ درختان سبز سے
آئے یہاں سب اور کف افسوس مل گئے

ہے کارساز گریۂ ابر اضطراب برق
تڑپا جو دل تو آنکھ سے دریا ابل گئے

حیران ہوں کہ ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے آب
جو ولولے شباب کے دل سے نکل گئے

عالم کو پھر سرانہ کہیں ہم تو کیا کہیں
آنا ہے یہ بھی کوئی کہ آج آئے کل گئے

کہتی ہیں مہر و ماہ کی جلوہ فروشیاں
کھوٹے درم بھی عالم فانی میں چل گئے

تاروں تو سر پہ گنج گراں پا لے گیا
ایسے بھی لوگ گذرے ہیں جو سر کے بھل گئے

بے دیکھے آگیا ارنی کو غش پہ غش
آئے وہ اور آنکھ بچا کر نکل گئے

ہم دل جلوں کے حال کا پروانہ ہی گواہ
پہنچے قریب اسقدر اوس کے کہ جل گئے

نادان ہیں جنکو قالب جا کی غرض ہے
مٹی کا مل گیا جو کھلونا بہل گئے

شاہد بھی شب کو بزم میں زندگی تھا شریک
کیا ٹوپیوں کا ذکر عمامے اوچھل گئے

میدان امتحان میں تھے کتنے ہی ملبوس
ٹھہرا گیا نہ زور پہ وہ آکر نکل گئے

کیا خوف کا بتانِ عمل کا بہار میں
ساقی وہ رت بدل گئی پیرے بدل گئے

جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
پھر کوہسار سامنے آئے تو ٹل گئے

رہتے تھے جو مدید خوف تق سے قصر میں
لے کر لحد میں ساتھ نہ اونچے محل گئے

عمریں جنھوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے

کس نے یہ کہہ دیا میرے ماتم میں رو دیے
نرگس کے پھول دست نگاریں سے گل گئے

مقتل ہے اہلِ دید کا کافر کے زیرِ بام
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظم عشق اور ہوس میں فرق ہے
بیمار میرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

۱۷ ——— ۴۹

دل اس کے سامنے ہے وہ ہے دل کے سامنے
پردہ جو ہے تو آنکھ کے اک تل کے سامنے

بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
کوئی تو آئے گا کشش دل کے سامنے

ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے

ہوگی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے

اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مٹ گئے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سلسلے

غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے

تیغ نگاہ ایک خریدار سے کہوں
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے

ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں
آ پہنچے اور اٹھے بیٹھے منزل کے سامنے

دیکھا رگِ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبضِ ناتواں تپشِ دل کے سامنے

شرطِ وفا کا پاس ہے کشتگانِ عشق
تیوری چڑھے نہ خنجرِ قاتل کے سامنے

قبلہ کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
الٹی چلی نہ سانس بھی منزل کے سامنے

کیسی نگاہ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربان ناقہ سلمیٰ ہوش باش
اوٹھ اوٹھ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری سزا تھی یہ جو نکلوا دیا مجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ بدرِ مقابل کے سامنے

اے نظم مجھ سے پوچھ دلِ قیس کی خبر
دیکھا تھا لوٹتے کسی محمل کے سامنے

۱۵۰ ——— ۲۴

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
ندی وہ سامنے ہے شرابِ طہور کی

خدمت ہے ترنم بانی گلشنِ طیور کی
ازبر ہیں عندلیب کو سطریں زبور کی

ہنگامِ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
واعظ ترے خیال میں چتون ہے حور کی

ان زاہدانِ خشک کو حصہ اگر ملا
مٹی ہوئی خراب شرابِ طہور کی

میدانِ حشر میں میرے نالوں کے سامنے
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آواز صور کی

تکیہ ہوا پہ مثلِ سلیماں ہو آ تو کیا
ملکِ دو روزہ چھاؤں ہے بالِ طیور کی

جاؤں گا مدرسہ میں نہ میں خانقاہ سے
رستے وہ سب ہیں پھیر کے راہیں ہیں دور کی

پائی ہے تیری دیکھنے والے نے وہ نگاہ
جھپکی ذرا نہ آنکھ تجلی سے طور کی

اوٹھے اگر تو سیکڑوں فتنے اوٹھا کے آپ
بیٹھے اگر کہیں تو شرارت ضرور کی

پڑھنے سے میرے خط کے بھی اوسکو حجاب ہے
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو بین السطور کی

کشتی مری بندھی ہوئی پانی میں ہے بڑا
گرداب غم کی فکر نہ موج سرور کی

سجدہ بھلا بتوں کو میں کرتا محال تھا
تصویر ہے کھچی ہوئی تیری غرور کی

ہمت سے اہل جذب کی قائم ہے آسماں
اس خیمہ سیہ میں طنابیں ہیں نور کی

ساقی لگا دے کشتی بادہ کنار آب
دریائے غم سے فکر مجھے ہے عبور کی

سردی سے ہم فقیروں نے مرنا کیا قبول
لیکن نہ کھال کھینچ کے پہنی سمور کی

فاقے گذر رہے ہوں جو اک پیر زال پر
طوفان نوح کیوں نہ خبر لے تنور کی

ہو اس کے سامنے بھی میں بے تابیاں وہی
نکلے گی آج لاش دل ناصبور کی

سمجھا میں آئینے سے جو ہو ذہن میں سوئے
بیٹھے ہوئے بنائیے باتیں فتور کی

خوں کر دیا ہے فندق رنگیں نے لعل کو
ساعد نے پھر دی ہے کلائی بلور کی

گلشن کو دیکھتا ہوں نرگس کی آنکھ سے
سنتا ہوں گوش گل سے کہانی طیور کی

مجھ کو یہ آسماں کی دورنگی سے ہے یقیں
دن آ رہے ہیں عیش کے راتیں سرور کی

میں پیر میکدہ کی نظر پر جو چڑھ گیا
چوٹی دکھائی دینے لگی کوہ طور کی

اس سال کربلا کی جو رخصت ملی مجھے
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اے نظم دیکھ لیجئے گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اُس سے بات آپ کی اور ضرور کی

۱۵۱ ——— ۱۹

دل میں شرارت اوسکی سمائی ہوئی سی ہے
کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے

صورت عتاب کی بنائی ہوئی سی ہے
اوحیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے

بادِ صبا یہ چال اوڑائی ہوئی سی ہے
سیکھی ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اوڑائی ہوئی سی ہے

میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں
یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

شاہانِ سرفراز کا اتنا تو ہے نشان
کچھ گرد آسمان چھائی ہوئی سی ہے

دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی
کانوں میں آجتک جو سمائی ہوئی سی ہے

منزل اوسے سمجھ کے کمر کھولتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

پہلے تو اضطراب تھا دل کو اس قدر
بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے

تڑپیں ہی میرے قتل سے دامن بھی یار کا
تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے

پانی نہ مانگا کشتۂ شمشیرِ ناز نے
اغنی کے زہر میں یہ کھلائی ہوئی سی ہے

آمد ہے ظلمتِ شبِ ہجراں کی دن سے آج
تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے

جلسہ تو ہوگا عید میں دورِ شراب کا
سرخی ابھی سے چہرہ پہ چھائی ہوئی سی ہے

اس بت کی دید کو نظرِ پاک میں ہے شرط
اور آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے

نالے اُسی طرف ہیں رواں آہ اُسی طرف
جانِ حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ
آنکھوں میں وہ یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصلِ بہار آ گئی اک جام پیتے ہی
ساقی گھٹا کچھ آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے بنے ہوئے شاعر کا ہی کلام
جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظمِ ترکِ ملاقاتِ خلق سے
لیکن بری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

۱۵۲ ——— ۱۰

تنہا نہیں ہوں گردِ دلِ دیوانہ ساتھ ہے
وہ ہر زہ گرد ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا
کیا دھوم ہے کہ سیکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دل میں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے
پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روزِ سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے
جب تک فروغِ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دیتا نہیں ہے ساتھ تہی دست کا کوئی
جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں میکدہ میں طریقِ فروتنی
جب تک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور
اور ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زنِ دنیا کے مکر کا
اپنی مدد کو ہمتِ مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب سے دلِ صد پارہ کم نہیں
جس بزم میں گئے یہی افسانہ ساتھ ہے

مانندِ گرد باد ہوں خانہ بدوش میں
صحرا میں ہوں مگر سرِ کاشانہ ساتھ ہے

۱۵۳ ——— ۱۵

باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی
کھولے تھے چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی

فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی
فوراً اٹھا ہے درد جو میٹھا گلا کبھی

تھی ہم سے آپ سے نہ ملاقات کیا کبھی
یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی

عالم کو قتل کیجئے ترچھی نگاہ سے
یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی

کعبہ سے بتکدہ میں گیا خیر ہو گئی
زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی

اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے
ایسی تھی برخلاف نہ آب و ہوا کبھی

دیکھا تھا اک نظر کہ چلی سونگھ کے تیر
کہتا رہا کہ اب سے نہ ہوگی خطا کبھی

تھا اوسکی میری بیچ میں دریائے آئینہ
اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی

گرداب میں جب آ گئی کشتی تو سمجھے ہم
ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی

اس بزم میں جلائے ہم شمع کی طرح
نکلا زبان سے نہ برا یا بھلا کبھی

گویا کہ زخم تھا میں دل روزگار کا
رویا کبھی تو حال پر اپنے ہنسا کبھی

بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی
اس کا بھی اس جہاں میں نہ ہو گا بھلا کبھی

زانو پہ مارا ہاتھ کہ پتھر سے پھوڑ سر
مٹتا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی

ظلمات میں تو جا کے نکل آئے تھے خضر
کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی

چشمے کبھی بہائے زہر اوگلا کبھی ہے زہر
میرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

۱۵۴ ——— ۷

کیا طرفہ عاریت نفسِ مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

چرخِ کوکب ایک نمودِ شرار ہے
ہستی سے جو کہ تا بہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ شہر
ہونے دے گر عدو فلکِ کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر بنائے عمر بھی کچھ پائدار ہے

ہے یہ صدا شکست میں جامِ حباب کی
طرزِ طلسمِ نفسِ مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاکِ گریباں کہ آہ میں
اندازِ پرفشانیِ بادِ بہار ہے

فکرِ رسا کی ہیں قدر اندازیاں عجیب
جو طائرِ خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ ——— ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثالِ نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
وہ ہے مژہ کہ اشکِ ندامت سے تر رہے

دو دن سرائے دہر میں آ کر اتر رہے
کہنے کو سب کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آہستگی کی چال
تو چاہتی ہے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب قاصد پھر اک نئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیالِ ضبط نے رسوا کیا مجھے
نوکِ مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی روا نہ ہو اگر افشائے راز ہو
بس کاروانِ آہ مرا ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خطِ تیغِ یار میں
ہم معرکہ میں عشق کے سینہ سپر رہے

میں نے کبھی پڑھی جو دعائے ہلال بھی
ابرو کسی حسین کے مدِ نظر رہے

خورشید پر یہ خندہ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشک گل پہ جو وقت سحر رہے

اے نظم ساتھ نبھ نہ سکا اہل ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

۱۵۶ ——— ۱۱

میں ہی رہا نہ اے شب عشرت نہ تو رہی | رونے کو لاش پر جو رہی آرزو رہی
وقت سحر نہ بزم طرب رو برو رہی | اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
سمجھو گے تم نہ بات زمانو گا میں کبھی | میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
خلوت میں آئینہ نے بھی دیکھا ترا جمال | او بیوفا رہی تو مجھے آرزو رہی
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں | اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی | ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
حیرت سے اپنی درس خموشی ملا مجھے | طوطی کو آئینہ سے اگر گفتگو رہی
عالم میں اے اجل نہ کوئی تمہارا فریق یار | میں تیرے ساتھ اور مرے ساتھ تو رہی
تکلیف تن سے روح خدا جانے کس طرح | گر وقت نزع کش مکش آرزو رہی
بخشش کا حکم ہو گیا رحم اس کو آ گیا | جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیجا نہ تھی یہ آمد و رفت نفس بھی نظم
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

۱۵۷ ——— مضمون ظلمات دو بار ——— ۱۵

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے
کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے
بندہ ہے رند مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بوریئے کے بوئے ریا نہیں ہے
پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سروِ چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے
ہے گلبنِ شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے
نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے
کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے
بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہوگا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے
اہلِ دول نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے
کیا جانے دردِ ہجراں کیا جانے آہِ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے
یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے
جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے
حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینہ سے پوچھو میری خطا نہیں ہے
کہنے سے تیرے ناصح چھوڑ دوں میں ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا کچھ سر پھرا نہیں ہے
نظم آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۵۸ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ۱۳

لسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے
فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آکے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے
روا روی میں ہیں ہم، سن لو قافلہ والو
کہ جس کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

نمودِ عشقِ پیری ہوا اجل آئی
چراغِ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہو جیے اس دل پہ جو صاحبِ درد
وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے

یہ کیسا حسن کا نشہ یہ بول چال ہے کیا
زبان بہک کے چلے پاؤں لڑکھڑا کے چلے

سنا ہے برق کو اک لاکھ ہے بلندی سے
بشر خدا سے زیادہ بھی سر اٹھا کے چلے

خدا کے واسطے اے صبر و تاب و ہوش و خرد
کہاں چلے کہ مجھے بیڑیاں پہنا کے چلے

یہ دیکھنا ہو کہ ہے دل کی لاش اور میں ہوں
خبر نہیں ہے مجھے وار کب ادا کے چلے

کبھی جو آ گئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے
دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظارہ جس کا ہو عالم کو مایۂ حسرت
وہ راستہ میں نہ کیوں اپنا منہ چھپا کے چلے

جب اپنی آنکھ ہوئی بند سب کی آنکھ کھلی
جو گہری نیند میں تھے انکو ہم جگا کے چلے

دھوئیں اڑا دے اے نظم تیری باتوں نے
رقیب جل کے اوٹھے پیچ و تاب کھا کے چلے

۱۵۹ ـــــــ

گدائے کوچۂ محبوب را ہمی رسید | شکست طرف کلہ شوکت جہانداری
خضر بہ حالت تنہائیت دلم سوزد | چہ لطف زیست کہ اندوہ جاودانی داری

بنال نظم کہ ایں بزم میگسار انست
شراب درد تو در شیشۂ فغاں داری

۱۶۰ ——— ۱۸

کتاں کیطرح جو نازک جگر نہیں رکھتے | وہ ذوق جلوۂ حسن قمر نہیں رکھتے
نہ دے سکیں گے مرا ساتھ رہروان طریق | وہ یوں قدم دم شمشیر پر نہیں رکھتے
سفینہ اپنا ہی صبر و رضا کے ساحل پر | امید بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے
یہ راستی یہ تواضع جو سرو و بید میں ہے | شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے
مریض غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک | کہ چارہ گر تو امید سحر نہیں رکھتے
اوڑا دی ای قدر افگن لگا کے تیر کوئی | ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے
وہ لوگ جو ہیں رہ مستقیم کے سالک | قدم ادھر نہیں رکھتے ادھر نہیں رکھتے
فروتنی سے کیا سرکشی کو یوں پامال | کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے
فلک نے وہ ہیں شب غم کے جاگنے والے | سوائے رنگ پریدہ سحر نہیں رکھتے
عزیز خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ | سر غرور و دل کینہ نہیں رکھتے
ستارہ ریزی شام طرب میں محو ہیں جو | نفس گدازی باد سحر نہیں رکھتے
ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پر خندہ | مگر شکایت داغ جگر نہیں رکھتے

داغ اپنا بھی ہے لاسکان پر لیکن
فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا
زبان حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤنگا اونھیں میں چاک چاک جیب شکیب
کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں میں بلبل شیدا کے نیشتر ہوں تو کیا
جو کوچۂ رگ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشم محبت احباب
شعاع مہر ہے تار نظر نہیں رکھتے

اونھیں کے حلقہ کا اے نظم جرعہ نوش ہوں میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

۱۶۱ ——— ۱۷

جہان کس کا ہے عمر گریز پا کس کی
یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا
گناہ کس نے کیا آگئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا
لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہی درپے جان و دست درپے دل ہے
بیان کس سے کروں جا کے میں جفا کس کی

ٹپک پڑی ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو
یہ سچ بتا تجھے یاد آگئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار
برا کہے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر
یہ کیا ہوا مری پیچھے پڑی بلا کس کی

وہ آکھڑا ہوا بالیں پہ اور میں اوٹھ بیٹھا
کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے
لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا تھا سایہ دیوار میں گذر کس کے
اوڑالی تو نے سعادت پر ہما کس کی

سبک روی میں بھی غنچوں کے دل مسل ڈالے
یہ تیری چال میں شوخی ہے اے صبا کس کی

یہ کس حسین کی اتران ملی تجھے اے گل
تری گلے میں ہے مسکی ہوئی قبا کس کی

یہ تیری عشوہ گری بے سبب نہیں نرگس
کھبی ہوئی تری آنکھوں میں ہے ادا کس کی

یہ تو ہے کیوں ہمہ تن گوش اے سگوفہ باغ
یہ گونجتی ہے ترے کان میں صدا کس کی

چمن میں چھو تو دیکھا ہے شاخ گل تجھ کو
بلائیں لیں ترے ہاتھوں نے بارہا کس کی

یہ کس کے شوق میں اس کا جگر ہوا ہے لہو
یہ بے پسے ہوئے پامال ہے حنا کس کی

عبث ہے آپ کو تغیر حال کا رونا
جناب نظم رہی ایک سی سدا کس کی

۱۶۲ — ۱۷

قریب کتنے ہیں آواز شربہ کس کا ہے
میں چپ ہوں منہ بھی وقت گریہ کس کا ہے

نجانے دیر میں واعظ یہ شب کو کیا گذری
کہ ایک شور تھا زندوں میں یہ کس کا ہے

نہ ساتھ لایا ہے کوئی نہ لے کے جائے گا
نہ بھول اس پہ ارے مال و زر یہ کس کا ہے

وہ زندہ ہم ہیں کہ جھجکے کہتی ہے دوزخ
خدا کے واسطے دامان تر یہ کس کا ہے

جو دل جدا ہوا پہلو سے دل کا غم تو ہے
جو وہ نہیں نہ سہی شکر گریہ کس کا ہے

ابھی نور و تھم دیکھ جذب شوق دیکھ لیا
یہ کس نے بات کی پھر منہ ادھر یہ کس کا ہے

جمال ہوا ہے دگرگوں کسی کے جلنے ہی
کہ اپنے گھر کو یہ کہتا ہوں گھر یہ کس کا ہے

یہ کب کے دوست ہیں سیر ہوا اس سے پوچھتے ہیں
کہ داغ خون کی تلوار پر یہ کس کا ہے

بہر کے غیر سے کیسا نکل گئے ہو نلوہ
یہ آگ کس کی لگائی ہے شعر یہ کس کا ہے

لگاؤ تم اسے چھریاں کہ پائمال کرو
قسم لو ہم سے جو پوچھیں جگر یہ کس کا ہے

ادا کا وار بھی چل جائیگا خبر تمہی کو
میں دیکھتا تھا کہ تیر نظر یہ کس کا ہے

بنایا سرمہ دنبالہ دار کو جو کمند
شکار آپ کو مد نظر یہ کس کا ہے

نہ منہ لگا دو رقیبوں کو ہم نہ کہتے تھے
زباں بگڑ گئی دیکھو اثر یہ کس کا ہے

مرض پہ کا ساری ہے بزم عیش میں بھی
خبر ہے جام ہی دان سر یہ کس کا ہے

کھلا نہ خانہ تن کا بھی اپنے کچھ اسرار
کہ اس مکان میں آخر گذر یہ کس کا ہے

اگر اجل سے ڈریں بھی تو کیا سمجھ کے ڈریں
پھر انتظار میں عمر بھر یہ کس کا ہے

تو روز حشر بھی میں نشہ میں جو رہے ناظم
خدا سے سامنا اے بے خبر یہ کس کا ہے

۱۶ ۳ ——— ۱۶

نہ اوتری بام سے جب تک دوپہر گذرے
ہم ایسے سایۂ دیوار سے بھی ڈر گذرے

جو وار کرنا ہو سفاک کو تو کر گذرے
کہ آب تیغ کہیں سر سے ہاتھ بھر گذرے

جہاں کی سیر میں انسان نہ بے خبر گذرے
بسان ابر ہے لازم بچشم تر گذرے

کمند آہ کو پھینکوں میں بام گردوں پر
جو گیسوئے شب دیجور تا کمر گذرے

ہمارے غنچۂ دل سے وہ پھول ہی اچھے
جنہیں ترے خم گیسو میں رات بھر گذرے

نشانہ غیر کو تو نے بنایا تھا جن کا
وہ سب خدنگ مرے دل سے پیشتر گذرے

تڑپ کے رہ گیا کوئی تو اس کو کیا پروا
کرشمے اپنے نگاہوں سے پیشتر گذرے

غم و الم کی جو راتیں ہیں وہ نہیں کٹتیں
خوشی کے دن تو ادھر آئے بس ادھر گذرے

فقیر ہیں نہیں جھکتے مگر کسی سے ہم
اسی روش پہ سلاطین تاجور گذرے

بہکتا رہ گیا واعظ طریق عرفاں میں
خضر کبھی نہ ادھر راہ بھول کر گذرے

گر سمجھ کے اٹھا لیتے خاک سے ہم کو
نہ اس طرف سے کبھی صاحب نظر گذرے

نہ ہم نے ہاتھ سے سر رشتۂ وفا چھوڑا
ہزار ظلم و ستم ایک جان پر گذرے

بنا ہر ایک نفس برق خرمن ہستی
جنوں میں آپ سے جب صورت شرر گذرے

دلوں میں گھر ہے زبانوں پہ ذکر ہے اب تک
کہیں نشاں نہیں ان کا جو نامور گذرے

جو سمجھے حرمت میخانہ تو تو اے واعظ
ادھر سے گذرے تو احرام باندھ کر گذرے

مجھے بھروسہ ہے نظم اوس کی رحمت کا
یقین ہے میرے گناہوں سے وہ بھی در گذرے

۱۶۴ ——— ۱۹

شب فراق میں کب تک قضا نہیں آتی
میں دیکھتا ہوں کہ کیونکر بھلا نہیں آتی

نگہ کے چلتے ہیں تیر اور صدا نہیں آتی
یہ سنتے آئے ہیں لیکن قضا نہیں آتی

یہ کس ادا سے پریشاں ہوئے ترے گیسو
کہ جب ہے ہوش میں باد صبا نہیں آتی

ترا شہید محبت ہے زندہ جاوید
جنازہ اٹھ بھی گیا اور قضا نہیں آتی

بلا کشانِ غمِ عشق تو مبارک ہو
کہ دردِ دل کی کسی کو دوا نہیں آتی

جو پوچھ راز حقیقت تو پوچھ رندوں سے
کہ اس طرف کی خبر جا بجا نہیں آتی

غرورِ حسن بتوں کا وہ کوہ تمکیں ہے
پکارو لاکھ پلٹ کر صدا نہیں آتی

نہ سیکھیے گا کہیں آئینہ سے بے شرمی
کہ اوس کی آنکھ میں مطلق حیا نہیں آتی

جفا کا ذکر جو چھیڑا کہا نہیں سنتے
وفا کو اوس سے جو پوچھا کہا نہیں آتی

جواب صاف ملا ہر طرف سے قاصد کو
اجل بھی ناز سے کہتی ہے جا نہیں آتی

تمہیں جہاں کے حسینوں سے لے گئے بازی
کسی کو چال تمہارے سوا نہیں آتی

غم و الم کا ہے رونا نہ درد کا ہے گلہ
مجھے شکایتِ اہلِ وفا نہیں آتی

نہ جائے بچھڑے ہوئے دوست پھر ملیں نہ ملیں
وہ راہ ہے کہ صدائے درا نہیں آتی

شبِ فراق میں ہے آہِ نارسا سے عجب
کہ آگ خرمنِ مہ میں لگا نہیں آتی

خدا کے سامنے جاتے ہو کس طرح دیکھیں
کسی سے شرم تمہیں تو ذرا نہیں آتی

پیام لا کے کسی کا یہ ہو گیا ہے غرور
بغیر ناز کئے اب صبا نہیں آتی

کریں گے دہر سے کیا شکوہ نامرادی کا
ہمیں کو خود طلبِ مدعا نہیں آتی

اتر کے عرشِ بریں سے مراد آتی ہے
یہاں زباں سے لبِ تک دعا نہیں آتی

جو منع ہوتیں یہ مستیاں بہار میں نظمؔ
تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی

لگا لے پیچ مجھی پر مرے سکھائے ہوئے
چلے مجھی پہ وہ فقرے مرے بتائے ہوئے

چلے لگا سر و جو دامن کو یوں اٹھائے ہوئے
کہوں گا منھ پہ یہ انداز میں اوڑائے ہوئے

جو بزم انس میں ہیں تجھ سے لو لگائے ہوئے
تمام خلق سے بیٹھے ہیں منہ پھرائے ہوئے

کہو فلک سے گریباں ذرا بچائے ہوئے
چلا ہے نالۂ دل آستیں چڑھائے ہوئے

لگ پڑے اتر آنچل تو سیکڑوں فتنے
اوٹھیں گے دامن محشر میں پیچ کھائے ہوئے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہے شب کی بیخوابی
نگاہیں کہتی ہیں جادو ہیں جگائے ہوئے

خبر کرے کوئی ان کو مری اسیری کی
جو میں ہوئے چمن کا فریب کھائے ہوئے

اگر آفتاب قیامت نہ گریباں تم سے
ہم آپ ہیں عرق شرم میں نہائے ہوئے

حساب ہم سے بروز شمار کیا ہوگا
کہ چند روز میں وہ بھی گئے بتائے ہوئے

جنوں نے دیر کا رکھا ہمیں نہ کعبہ کا
ٹھکانے چھوٹ گئے سب کے لگائے ہوئے

متاع صبر و خرد اک نگاہ میں لے لی
یہ کب سے بیٹھے تھے مجھ پر ادھار کھائے ہوئے

غرور حسن غرور شباب استغنا
شراب کی ہیں کئی بوتلیں چڑھائے ہوئے

اوس میں ہو رشک حسینوں میں دیکھ کر مجھ کو
لگی ہے آگ کہ پھرتے ہیں تلملائے ہوئے

مری طرف نگہ ناز اور عتاب آمیز
نگاہ و تیر بھی اور زہر میں بجھائے ہوئے

ہنسی بھی آگئی اوس کو بزم ماتم میں
ابھی تو آنکھوں میں آنسو تھے ڈبڈبائے ہوئے

دکھایا پیر مغاں نے وہ جام میں جلوہ
کہ جس پہ حضرت موسیٰ ہیں حال ہی ہوئے

کیا ہے قصد تو میخانہ سے نہ نکلنے کا
نگاہ ابھی سے ہیں کچھ ہاں اکھڑ ہوئے

صلہ ملے تجھے کوثر پہ اس کا اے ساقی
کہ میکدے سے چلے پیاس تم بجھائے ہوئے

وہ چاہے قتل کرے چاہے وہ رہا کر دے
کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار سر جھکائے ہوئے

گلہ کروں گا نہ میں جو نصیب کا لکھا
قلم چلا نہیں بے ہاتھ کے ملے ہوئے

بروز حشر میں انکا مزاج پوچھوں گا
ترے جو وعدے پہ ہیں اعتبار لائے ہوئے

اب اوس شباب کو جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں میں
نہ گنہ رہا جسے خاک میں ملائے ہوئے

نظر لگے نہ کہیں آفتاب محشر کی
کفن میں لے چلے دامن و پیچھا ہوئے

اوٹھائے صور قیامت نہ خواب مرقد سے
مصیبتیں شب غم کی ہیں مٹ جائے ہوئے

پیالہ پینے کو بیٹھے ہو گر تو ہاں ندو
نظر سے پیر مغاں کی نظر ملائے ہوئے

چلا ہے نظم کہاں کشمکش میں دنیا کی
بغل میں شیشۂ دل سے دل لگائے ہوئے

۱۸

حسین ہو کے تبختر ضرور ہوتا ہے
ادا میں فتنہ نگہ میں فتور ہوتا ہے

جو ہونے والا ہے وہ تو ضرور ہوتا ہے
بری بلا یہ دل ناصبور ہوتا ہے

ہر ایک شے سے اسی کا ظہور ہوتا ہے
کہ آفتاب کا ذروں میں نور ہوتا ہے

ہر ایک قطرے میں دریا ہے کوئی کیا جانے
وہی سمجھتے ہیں جن کو عبور ہوتا ہے

ترے غبار شہیدان حسرت دیدار
اوٹھے تو عرش جو بیٹھے تو طور ہوتا ہے

بھلا سحر تو شب ہجر کی کجا لیکن
کفن سپیدۂ صبح نشور ہوتا ہے

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر میں
چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے

دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسی کو کوئی
یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے

چھپیں نہ ریزہ مینا کی طرح کیوں مژگاں
کوئی بھی نشہ میں اس طرح چور ہوتا ہے

قیام کب ہے جو حاصل بھی ہو فراوانی
ہوا پہ سایۂ بالِ طیور ہوتا ہے

سرائے دہر میں ہے کون آشنا کس کا
کہ صبح و شام درود و صدور ہوتا ہے

فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے
کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے

کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار
نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے

نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا
جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے

اوسے کرم پہ ہے اصرار ہم کو عصیاں پر
اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے

کیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ
اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے

سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا
کہ جتنا بڑھتا ہوں اوتنا ہی دور ہوتا ہے

جنوں نے کھینچا ہے دامن مرا اودھر اے ظلم
ہر ایک خار جہاں نخل طور ہوتا ہے

۱۶۷ ——— ۴

کسے سنے ہے ذرا پاس آکے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

کچھ اس ادا سے چلا ہے تو اوٹھ کے محفل سے
کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا
رولا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

سحر کو اوٹھتے ہیں وہ دیکھ کر کفِ رنگیں
اب آئینہ پہ بھی سکے حنا کے بیٹھ گئے

تڑپنا دیکھ سکے وہ نہ صید کا اپنے
نشانہ تیر نظر کا لگا کے بیٹھ گئے

یہ بزم بادہ کشوں کی ہے حضرتِ واعظ
غضب کیا یہ کہاں آپ آ کے بیٹھ گئے

جو در پہ اس کے ٹھہرنے دیا نہ دربانے
تو سامنے در دولت سرا کے بیٹھ گئے

چلا جو تیر تو سینہ پہ کیا ہم نے
اوٹھی جو تیغ تو گردن جھکا کے بیٹھ گئے

فلک سے کیا طلب مدعا کرے کوئی
در قبول پہ پہرے قضا کے بیٹھ گئے

کھڑے ہوئے تھے سلاطیں کے جو بلند مکاں
عروج اپنا فلک کو دکھا کے بیٹھ گئے

گرائے ابلق ایام کب وہ گرتے ہیں
جو شہسوار پڑی جما کے بیٹھ گئے

نظر کہیں نہیں اب آتے حضرتِ ناصح
سنا ہے گھر میں کسی سے لقا کے بیٹھ گئے

قدم ہی اوٹھتا نہیں میکدے سے جانیکو
ابھی اٹھے تھے یہاں سے پھر آ کے بیٹھ گئے

وہ اب کہاں ہے جو پہلے تھا نظمِ عالم
کہ سر پہ بارِ مصائب اٹھا کے بیٹھ گئے

۱۶۸ ——— ۹

ہوئے نہ ہم تو پشیماں کبھی وفا کر کے
تجھے بھی شرم کبھی آئی ہے جفا کر کے

سنبھلیے حضرتِ زاہد یہ بزمِ رنداں ہے
بلا میں ہم تو پڑے آپ کی صلا کر کے

خوشی یہ ہے دمِ آخر تھا لب پہ نامِ وصل
کٹی ہے عمر کی منزل خدا خدا کر کے

نصیب میں ہے تو پہنچیگی بھیک گھر مجھے
درِ کریم پہ آئے چلے صدا کر کے

کسی کو حیف اس انجام کی نہیں ہے خبر
چلے جہاں سے کیا ساتھ اپنے کیا کر کے

مآل دیکھیے فوارہ کے اوچھلنے کا
خزانہ ہو گیا خالی ذرا ذرا کر کے

ہوئی جو کچھ شنوائی جہاں کو ہے معلوم
ذلیل اور ہوئے ان سے التجا کر کے

زبانِ شعلہ سے گلخن میں برگِ گل نے کہا
خدا فقیر بنائے نہ بادشا کر کے

بڑے بڑوں کا یونہی زور دے گیا ہے نظم
کوئی جہاں میں برپا ہوا جفا کر کے

۱۶۹ — ۱۳

مزہ بہار کا اب کے تو اے جنوں نکلے
شکستِ توبہ سے آوازِ غنوں نکلے

جو تیرے دور سے ہم اے سپہر دوں نکلے
خراب میکدہ جام و ساز گوں نکلے

مراد مانگنے اپنے کو ہم سگوں نکلے
کہیں نہ بھیس بدل کر وہ ذوفنوں نکلے

کسی کی چشمِ سخن گو کے جو اشارے ہیں
نظر پہ ہی تو سب افسانہ و فسوں نکلے

ستارے شام کے ڈوبے ہوئے سے ہیں
سحر کو نکلے تو با حالتِ زبوں نکلے

وہ اہلِ ذوق جو عزلت گزیں ہیں
ترے حضور میں رہ کر جنوں نکلے

دل و جگر پہ ہمیں ناز تھا مگر وہ بھی
ہلاکِ غمزۂ ہا دوئے ذوفنوں نکلے

سنا فلک مجھے طرزِ فغاں سے
کسی طرح سے تو کچھ آتشِ درون نکلے

اگرچہ حسن کو تھی جوئے شیر کی خواہش
پکارا عشق کہ تیشہ سے جوئے خوں نکلے

عجب یہ ہے کہ یہاں سرکشی کرے انساں
جہاں کہ سات فلک ہو کے سرنگوں نکلے

تمہارے جلوہ کے آگے کسی کی ہستی ہے
تمہارے سامنے کس کی زبان ہوں نکلے

وہ شب کی دست درازی اسی نزاکت پر
سحر کو ہاتھ جو دیکھے تو نیلگوں نکلے

زمینِ شعر جواہر کی کان ہے اے نظم
کمال یہ ہے کہ جو منہ سے میں کہوں نکلے

۱۷۰ ——— ۱۹

پھلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفہ کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود بود سراب جہاں کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو ہمیں کیا اگر نہیں نہ سہی

فزوں حکایت تیر نگہ میں کیا کم ہے
اگر شکایت زخم جگر نہیں نہ سہی

نہ کوئی بات کہیگا دہن نہیں تو نہ ہو
نہ کوئی نام دھرے گا کمر نہیں نہ سہی

کب آئے حال کی مجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال سے میری خبر نہیں نہ سہی

نسیم صبح نہ آئے تو خواب مرگ تو آئے
سن اے فلک شب غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے پیارے
مجھے تحمل درد جگر نہیں نہ سہی

ٹھہر کے بزم شب عیش دیکھ لے اے چرخ
جو ایک رات یہ دوران سر نہیں نہ سہی

چٹک رہی ہیں جو کلیاں تو پھول منتظر ہیں
غرض کہ کیجئے نالے اثر نہیں نہ سہی

حباب خانۂ زاہد خمار ہے ساقی
ادھر تو دے کوئی ساغر ادھر نہیں نہ سہی

اجل ہے سر پہ سوار اور سامنے رخ یار
قدم تو اب نہیں ہٹنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل میں
ظفر نصیب میں تیغ و سپر نہیں نہ سہی

کسی کی آہ سے پتھر تو ہو چکا پانی
کسی کے دل پہ جواب بھی اثر نہیں رہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دل بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

ہمارے دل میں تو ہر لحظہ ہر گھڑی ہم ہیں
تمہاری بزم میں اپنا گذر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہل توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

یہی سمجھ کے سناتا ہوں درد دل اپنا
کہ جی تو بہلے گا اس کا اثر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اگل رہا ہے نظم
جہاں میں گر کوئی حفاظ نہیں نہ سہی

یہ نہ میں سمجھا نکالا تو نے بزم انس سے
لے گئی دشت امکاں کیطرف وحشت مجھے

دل کی محویت کا وہ عالم ابھی تک یاد ہے
آپ میں آنیکی ممکن ہی نہ تھی فرصت مجھے

خود نمائی کا عالم خود پرستی کا ہے دور
بیخودی رہتی ہے اب ویسی نہ محویت مجھے

مجھ کو منزل ہے خودی کی ہے سفر تیرے طرف
ہو گئی تیری جدائی عالم غربت مجھے

جتنا بڑھتا ہوں میں اتنا پیچھے ہٹتا جاتا ہے
دور کرتی رہتی ہے تجھ سے میری حیرت مجھے

آسماں میں تو نہیں ہے لامکاں میں تو نہیں
تجھ کو پا سکتا نہیں میں لاکھ ہو رفعت مجھے

اک نمائش سراب ریت کی سارا جہاں
ایک باغ سبز ہے بڑھکر نہیں جنت مجھے

شان تیری یہ کہ بے مانگے دو عالم دیدیا
حال میرا یہ کہ اب بھی رہ گئی حسرت مجھے

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی

ہیں تو صید تازہ تھا چوکا مگر صیاد بھی
پلکیں ٹانکی تھیں تو سی دیتا لب فریاد بھی

تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی سے ہم کو سایۂ شمشاد بھی

دل فیری پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی

ہیں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو باد بھی

غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی

یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی

اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے رحم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاتی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہو گئے آزاد بھی

آنکھیں پھوٹیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کور مادر زاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو مل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چونکے ہم ذرا
شورِ ماتم بھی رہا شورِ مبارک باد بھی

کی سوادِ شہرِ خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھ کر
چال پر چھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاتی ہے وفا اہلِ وفا کی اسقدر
جان دے کر مول لوں دردِ سرِ فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

قطعہ

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا قصور اور اس پہ یہ فریاد بھی
میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلّاد بھی ہے خنجرِ فولاد بھی
لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد بھی
میرے اشک و آہ پر جو باندھنوں باندھی گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفانِ ابر و باد بھی
بیج پر پھولوں کی اس نے کر دیئے ہیں رات بھر
گندھ گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی
ناز اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا مجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی
یہ غزل خوانی نہیں اے نظم ہے صورتگری
بار ہا بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

۱۶ ۱۷۲

چہروں میں جب سے جوشِ عشق میرے دل میں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابر تر ہے یا کہ ہے خمخانۂ کیف بہار
شاخِ گل ہے یا کہ پیمانۂ کفِ سائل میں ہے

تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسم زار میں
وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامنِ قاتل میں ہے

مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب
استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے

جان دینے کا مزہ اہلِ وفا سے پوچھیے
مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے

دیدۂ بیدار میں ہے ہُو کا عالم ہر طرف
بزمِ ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے

میں کسی کے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں
ورنہ ہے میری زباں پر جو تمہارے دل میں ہے

کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہی میں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے

کشتنی سمجھے لگے بس پھیرنے گردن پہ تیغ
یہ تو پوچھا ہوتا کچھ حسرت بھی تیرے دل میں ہے

ناتواں تھا میں اوٹھا سکتا نہ سختی راہ کی

بات اتنی ہے کہ دم اٹکا ہوا منزل میں ہے
اس کی چشمِ سرگیں سے ہو رہا ہے قتل عام
مشعلیں روشن ہیں اور اندھیرا اس محفل میں ہے
خونِ ناحق کا پتہ دیتی ہیں تیری شوخیاں
کچھ یہی انداز تو بیتابیٔ بسمل میں ہے
ناقہ ہے نخچیر مجنوں کی کمندِ آہ کا
بچ کے جا سکتی نہیں لیلیٰ اگر محمل میں ہے
کونسی جا جلوۂ جاناں نظر آتا نہیں
دل میں ہے آنکھوں میں ہے خلوت میں ہے محفل میں ہے
تیرا افسوں چل گیا عالم پہ اے زہرہ جبیں
ہند میں تو اور افسانہ تیرا بابل میں ہے
کس مصور نے بنایا آنکھ کی تصویر کو
دیکھ لو سارا طلسماتِ جہاں اک تل میں ہے

۱۰۳ ۱۳

زندگی جن سے تھی وہ مجمع پریشاں ہو گئے
سخت جاں تھے ہم کہ پھر جینے کے ساماں ہو گئے
آ کے مقتل میں ترے کشتے سلیماں ہو گئے

تیر جو اوڑتے ہوئے آئے تھے پریاں ہو گئے
حلق سے اوتری بھی تو اوتری لہو ہو کر شراب

ہجر ساقی میں مجھے دو گھونٹ چھہ ماہ ہو گئے
مذہبِ اہلِ وفا میں رو کے ہیں مجرم ہوا

اشک گر کر آنکھ سے دست و گریباں ہو گئے
کیا بتاؤں رو رہا ہوں کب سے اے اہلِ جہاں

نوح کے کتنے ہی اس عرصے میں طوفاں ہو گئے
کبر جن کا بڑھ گیا حد سے وہ ہیں تنگِ جہاں

جو کہ جامے سے ہوئے باہر وہ عریاں ہو گئے
آنسوؤں میں ہے مرقع مجمعِ احباب کا

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئے
قصرِ قیصر تک فرشتہ جا نہ سکتا تھا کبھی

کیا فضا آئی تو اندھے سب نگہباں ہو گئے
جان جائیگی نہ چھوڑیں گے درِ میخانہ اب

ہم سے اور پیرِ مغاں سے عہد و پیماں ہو گئے
رہ گئے جی کھول کر رونے کے جو ارماں تھے

چھپتے چھپتے دل میں آخر زخم خنداں ہو گئے

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے
دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے
مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دئے
منھ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

۱۶ ولہ ۱۶۴

دیکھنا شورش و فورِ گریۂ سرشار کی
گرد ہو کر بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی
سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی
ہم نے وہ میدان مارا ہے کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی
شش جہت ہے اک گہر وندارہ گذار سیل پر
جس میں گردوں ایک چلتی چھاؤں ہے دیوار کی
سب کو قسمت نے کیا ہے لا کے اس زندانِ قید
رہنے والی ہے اجل جس گنبدِ دوار کی

جان دے کر مر کے پہنچا ساحل مرقد پہ میں
جھیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدھار کی

صفحۂ عالم پہ طومارِ شبِ غم ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی

بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جتنی ہے دولت دیدۂ بیدار کی

دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گل زار کی

ابر کو جوشِ جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامنِ کہسار کی

موج ہے آبِ گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لبِ گفتار کی

ہاتھ میں لے آئینہ کیطرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی

دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردش مردمِ بیمار کی

دشتِ حیرت میں تھا سرگرداں کہ اٹھا گرد باد

کھل گئی مجھ پر حقیقت گنبدِ دوار کی
جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ سے
مردم دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی
نیم بسمل ہے نہ مرتا ہے نہ اب جیتا ہے نظم
پڑ گئی اوچھی سروہی ابروئے خمدار کی

۱۵ ۱۷۵

آ کے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اولٹی پھری
آج کیا ندی بھی الٹی ہوا اولٹی پھری
آتے آتے لب پر آہِ نارسا اولٹی پھری
وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری
مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابروؤں کا چل گیا
اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری
اسکا نظارۂ رخسار روشن کی نہ تاب
جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری
راست بازوں ہی کو پیسا آسماں نے اتدن
والے نسمت جب پھری یہ ایسا اولٹی پھری
جو بڑا بول ایک دن بولے تھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری
رزق کھا کر غیر کی قسمت کا زنبورِ عسل
تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری
تو ستائش گر ہے اوس کا جو ہے تیرا مدح خواں
یہ تو اے مشفق ضمیر[1] مرحبا الٹی پھری
جس پر آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر
جنسِ دل مانندِ جنسِ ناروا الٹی پھری
یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور
وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا الٹی پھری
گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب
آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا الٹی پھری
جی گیا میں اوس کے آجانے سے دشمن مر گیا
دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا الٹی پھری
مر گیا بے موت میں آخر اجل بھی دور سے
کوچۂ قاتل کا بتلا کر پتا الٹی پھری

[1] یعنی مرحبا یک میں جو ضمیر ہے یا مرحبا بہ من جو ضمیر ہے ان دونوں ضمیروں کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا بی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم نظم کدہ سا ہولناک
موجِ سیل آئی تو لے کر بوریا اولٹی پھری

۱۷۶ ۱۵

ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرِ بالیں اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل۔ لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ خیر ہے چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفاں پر طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
مڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا
مانعِ وہم دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثل قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی

باغِ عالم میں بہارِ زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی

کج روی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی

کوئی رسوائی تک آنے کو نہ اوٹھا تھا قدم
دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی

عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا اے چشمِ تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی

کھل گئے گل۔ عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخنِ موجِ صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی

شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دہلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی

گنبدِ اک وہ بھی ہے وہم و شک کی بازی گاہ کا
بات جو سمجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی

ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم

باعثِ ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

۱۷۷ ۳۶

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیٔ ہنگامۂ بازار رسوائی نہ تھی

شغلِ خود بینی تماشانِ بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اوٹھا گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لئے
منزلوں گرد رہ آ ہوئے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم رندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

تشریح: اپنی ناشناسائی ہنگامۂ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھو کہ ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لوازم سے ہے ناشناسائی یعنی عدم ادراک ہی ادراک عدم کا باعث ہوا جس طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے

ترک لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوائے بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبع یار تھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گل کے تھے مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوں میں یاد ہوگا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشم تر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزار سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شور محشر جاگ اوٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترک الفت کرکے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہدینا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی
ساتھ غیروں کے تھے ہم بھی دورِ ساغر میں شریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی
اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تلوار سے کہیں
یوں کبھی رنگ حنا نے آگ بھڑکائی تھی
وہ تو آنکلا تھا لیکن ہو گئی کیا جلد صبح
میں نے اب تک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی
بات کی تو نے تنِ بیمار میں جان آگئی
سچ بتانا پھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی
آگیا کیا چین مجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر
یہ علاج دردِ سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی
صور اسرافیل سے میں جاگنے والا نہ تھا
کیا کہیں تو نے تو آکر قبر ٹھکرائی نہ تھی
ہم سے بچ کر تخت پر یوں کا نکل جانا کہاں
اتنی بھی کوتہ کمندِ ناشکیبائی نہ تھی
کشتیِ مے پر ہے اب تختِ سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر بادِ پیمائی نہ تھی

قلزم مے میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر سچ بتانا اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں دو دل ملے دیکھے نہیں
ان میں یکرنگی نہ تھی تو اون میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہِ شوق نے
حشر کے دن ہم کو فکر برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیب انجمن
جس بے پردہ تھا جب تک کسو یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آ جاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساط اے چرخ مینائی نہ تھی
ہم تھے ساقی تھا ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جب زمانہ میں بنائے چرخ مینائی نہ تھی
میرے لب سے ہو گیا کیسا گل رخسار سرخ
تیرے لب سے برگ گل اس طرح شرمائی تھی
راہ میں شل ہو گیا برہان و حجت کا قدم
پیروی عقل نادانی تھی دانائی نہ تھی
پوچھنا ہے نظم مجھ کو نرگس بیمار سے
کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

۱۷۸ ۱۱

شرم یہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لئے
سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے
غور کر طرز جفا کو دیکھ انداز وفا
تیغ گریاں کس لئے ہے زخم خنداں کس لئے
کھول کر بند کفن پوچھے کوئی احباب سے
منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لئے
سر بزانوئے توکل تن بہ آغوش رضا

ذکر سر کس واسطے ہے فکر ساماں کس لئے
صحبت بے مغز گر ایذا رساں ہوتی نہیں
درد سر رکھتا ہے پھر شیریں بیاں کس لئے
سن کے حرف آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خیر ہے کچھ ہو گئے شمشیر عریاں کس لئے
منہ سے تو نے کہہ دیا جو آگیا مجھ کو یقیں
جھوٹی قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے
ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
جا کے اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے
اک نگاہ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں تار
جان و دل کس واسطے میں دین و ایماں کس لئے
خضر بھی ہیں غرق گرداب اجل میں ایکبار
اے سکندر ہے تلاش آب حیواں کس لئے
کس بہار حسن سے اے نظم تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کیطرح جیب و گریباں کس لئے

۱۷۹ ۶

مے پلا ساقی ارے فصل بہار ایسے میں ہے

آبِ حیواں دے حیاتِ مستعار ایسے میں ہے
سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگامِ مے نوشی نہیں
مجھ کو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے
پھر نہ یہ سمرن ملے گی یادِ حق کے واسطے
آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے
وقت ہے صیدِ رمیدہ جا کے آنیکا نہیں
وار کرنا ہو تو کر زود پر شکار ایسے میں ہے
بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا
پھیر دے آکر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے
دیکھ تو حیدر کوئی تیرا بھی ہے پرسانِ حال
چند ساعت اور ابھی روزِ شمار ایسے میں ہے

۱۸۰ ۱۸

سنگِ پانی ہونے کو بانی ہوا ہونے کو ہے
دیکھ اے منکر یہ بھی دنیا فنا ہونے کو ہے
پرسشِ اہلِ گنہ روزِ جزا ہونے کو ہے
گرمیٔ بازارِ جنسِ ناروا ہونے کو ہے
اپنی بے صبری سے عکسِ مدّعا ہونیکو ہے

آئینہ دار اثر دستِ دعا ہونیکو ہے
دل وہی دل ہے حواس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے
ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
بڑھتے ہی بڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے
قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے
گو سراپا مثلِ اخگر ہوں نہ کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے
بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے
شان اُس کی دیکھ کر سمجھے تھے ہم روزِ الست
دولتِ کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے
کس طرح بازو پہ میں باندھوں دعائے چشمِ زخم
اوس کی سفا کی پہ شورِ مرحبا ہونیکو ہے
ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خال رخ
دانہ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اوٹھنے کو ہے اب سامنا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکر بے جا سے منغص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زنداں و گریباں کے ستم کی داد دو
مژدہ اے اہل جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آگیا ہے شرم عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
بہ کے رخساروں پہ دُرِّ بے بہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

۱۵ ولہ ۱۸۱

لہر میں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حُسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے

مژدہ اے دل پھر ہوا ہے انقلاب آنیکو ہے
دورِ گردوں ہو چکا دورِ شراب آنیکو ہے

آنکھ میں تیری مروّت بھول کر آتی نہیں
شرم سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے

کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ او واعظ نکال
مجھ پہ رحمت اُو ترنگی تجھ پر عذاب آنیکو ہے

جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کیطرف سے بھی جواب آنیکو ہے

پتلیاں پتھرا چلی ہیں کرتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہو کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے

دیکھیے کیا رنگ ہو محفل کا اہلِ مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے

ہجر کی اک شب میں گھڑیاں بج چکی ہیں دو ہزار
اے فلک سمجھوں گا میں روزِ حساب آنیکو ہے

سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لبِ بامِ آفتاب آئینو ہے
شیشہ تو بہ نہ جوشِ کشمکش میں ٹوٹ جائے
جھوم کر صحنِ گلستان میں سحاب آئینو ہے
آگئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم
یا حجاب آئینو ہے یا اب عتاب آئینو ہے
خانۂ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش
اس سرا میں کاروانِ اضطراب آئینو ہے
جوشِ گل کی کشمکش میں آگیا سبزہ کو غش
شیشۂ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آئینو ہے
نظم دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون
عرش سے مسجد میں حکمِ سدباب آئینو ہے

۱۸۲ ولہ ۱۶

جشنِ جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے
کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے
داورِ حشر آرزوؤں کا نکلنا تو کجا
جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے
کشتۂ تیغِ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے
پوچھتا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہے خبر

سارا عالم اس ساغرِ گیتی نما سے پوچھ لے
دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہے ثبوت

گر تجھے اور نہیں زلفِ دوتا سے پوچھ لے
ہر قدم پر آتی ہے شہرِ خموشاں سے صدا

خاک میں ہم مل گئے ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے
اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوشِ بہار

راہ کجلی بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے
آ گیا آتش قدم کہنے پہ تنہا اس قدر

جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگِ حنا سے پوچھ لے
لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے

آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے
زالِ دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو

بے وفائی اس کی مردانِ خدا سے پوچھ لے
جوشِ مستی میں نہ اتنا بے حجابانہ گذر

راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے

مفت کا چکر ہو گر پھرنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے

منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے

جس ہنر سے خود ہو عاری سیکھ لے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے

پھر شکیبائی کا دعویٰ ہو چلا ہے نظم کو
پھر مزاج آ کر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھیے
حال یہ یارانِ بخدوبے ستوں سے پوچھیے

دل کے خوں ہونے کی حالت اشک سے پوچھیے
جان پر کیا بن گئی سوزِ دروں سے پوچھیے

آسماں سے کیجیے باتیں ذرا بن کر غبار
وجہ بربادی کی کچھ گردوں دوں سے پوچھیے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے

سرکشی کا دیکھیے سرو صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخِ سرنگوں سے پوچھیے

دہر ہے مانندِ قلزم آسمان مثلِ حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردونِ دوں سے پوچھیے

تا بلب آتا ہے نالہ کروٹیں لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذت ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ولہ ۱۴

عشق خط سے ہے سوا لفت لبِ خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتشِ خس پوش کی

ہم نے اس ساماں سے لی کوچۂ قاتل کی راہ
بارِ گردن سر کبا گردن وبالِ دوش کی

کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھیے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نا و نوش کی

خاکدانِ دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ یہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پر آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن گاہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم ہے یہ مستوں کو گماں
رال ساغر پر ٹپکتی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمند زلف کم تھی قتل عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا طوار زیب دوش کی

رنج دینا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعت عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

مٹ نہ جائے آسماں اک دن گہر دندی کی طرح
اشک غم میں شوخیاں ہیں طفل بازی کوش کی

احتمال اب تو مکان کا لامکان پر ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

خط ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمال شوق بھی مثل

تنگ آنا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی
آرزوئے دل کو سن سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظم ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تمہے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے

غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دہر چلے

ضعف میں بھی ہو گئی طے راہ شوق
ہر جگہ گر گر اوٹھے اوٹھ کر چلے

کیا گناہ آفت تھی کیا عشوہ تھا قہر
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے

زیر گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے

ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر نہ رک کر چلے

سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا گیروا بستر چلے

کیا مزاج دہر کی اصلاح ہو
چار دن اپنی سی ہم بھی کر چلے

اس کو پھر تیغ آزمائی کا شوق
کیا ہوا گر زخم میرے بھر چلے

ساقیا ہم سب ہیں رند پاک باز
جادۂ تسلیم پر ساغر چلے

خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے

قبر میں گھٹ گھٹ کے یوں رہ جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے

وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤ اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتی مے لے کے ساقی جلد آ — جھومتے دریا پہ ابر تر چلے

۱۸۶ — ۲۱

تندیٔ مے حیرت افزا ہو گئی — موج برق طور سینا ہو گئی
جب زبان حال گویا ہو گئی — بات خاموشی میں پیدا ہو گئی
دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی — آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی
عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی — شام شب صبح فردا ہو گئی
دب گیا گرد لحد ورت میں جو دل — دفن ساتھ اس کے تمنا ہو گئی
آتی ہے تار نفس سے یہ صدا — روح مرغ رشتہ بر پا ہو گئی
صبا گریہ مجھ کو راس آ نہیں — پھر کھٹک آنکھوں میں پیدا ہو گئی
دل میں چپکے سے برا آیا خیال — اور خبر عالم میں افشا ہو گئی
پھر تجھے انساں کو نظر آتا نہیں — آنکھ جب محو تماشا ہو گئی
ہاتھ رکھتے ہی دل بیمار پر — مضطرب نبض مسیحا ہو گئی
کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاک جم — تیری دولت کس نے لی کیا ہو گئی
پیرزن کے کلبۂ تاریک سے — روشنی طاق کسریٰ ہو گئی
چشم موسیٰ کو تھا ایسا شوق دید — اک نگہ برق تجلی ہو گئی
عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا — پھر جوان کیونکر نہ لیتا ہو گئی
دست و پا مارے کسی نے اب تو کیا — سر سے اونچی موج دریا ہو گئی

آگیا گلشن میں فرمانِ بہار
زلفِ سنبل خطِ طغرا ہو گئی

عشق بھی اک قوتِ اشراق ہے
دل سے دل میں راہ پیدا ہو گئی

دار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے
کیوں طبیعت ناشکیبا ہو گئی

دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات
وہ بھی چتون سے ہویدا ہو گئی

ہو گئی نانِ جویں سدِ رمق
لیجیے آباد دنیا ہو گئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ ہر نعمت مہیا ہو گئی

۱۸۷ ـــــــ ولہ ـــــــ ۱۳

سجھ سے زنار کیوں کیسی کہی
زاہدِ عیار کیوں کیسی کہی

کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی
چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی

ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں
کیجیے اقرار کیوں کیسی کہی

روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے
اس کو آئے پیار کیوں کیسی کہی

کہدیا میں نے سحر ہے جھوٹھ موٹ
ہو گئے بیدار کیوں کیسی کہی

ایک تو کہتے ہیں سدا بھتیاں
اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی

ناصحا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ
عقل کی ہے مار کیوں کیسی کہی

یا خفا تھے یا ذرا سی بات پر
ہو گئی بوچھار کیوں کیسی کہی

مجھ سے بیعت کرنے تو بھی واعظا
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سرمہ دے کر دل کے لینے کا ہی قصد
آنکھ تو کر چار کیوں کیسی کہی

جان دیدے چل کے در پر یار کے
او دل بیمار کیوں کیسی کہی

کیا ہی جھگڑے ہوتے کی بات پر
ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

۱۸۸ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

ہیچ نظر و نیل اگر عالم فانی ہو جائے
پھر ہی ہیچ مدانی ہمہ دانی ہو جائے

کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے
رنگ بحر فلک آبی کبھی پانی ہو جائے

کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے
درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے

دل اگر رہرو اقلیم معانی ہو جائے
مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے

خسرو عشق نے تیشہ کو وہ عزت دی ہے
سر فرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے

جوش میں آئی اگر دل جو ہی اک قطرہ خوں
گرم ہنگامۂ خونابہ فشانی ہو جائے

جائے عبرت ہی کہ یوں کوچ کرے لشکر گل
جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے

اک ذرا تشنگی شوق میں تاثیر ہے شرط
پھر جو پتھر کی طرف دیکھیے پانی ہو جائے

کبھی مرنے کا ہی مذکور کبھی حشر کا ذکر
پاس واعظ کے جو بیٹھے خفقانی ہو جائے

دہن زخم سے کشتوں کے نکلتی ہی دعا
کہ زیادہ تمہے خنجر کی روانی ہو جائے

شکوہ ہجر جو کرتا ہوں تو ملتا ہے جواب
صبح ہو جلد نہیں ختم کہانی ہو جائے

اس قدر جوش ہے واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو
صرف رندوں ہی پہ زورِ ہمہ دانی ہو جائے

گوہرِ پند کجا اور کجا ناشنوا
دیکھ پتھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے

رشتہ در رشتہ جو ہے طولِ امل لطف نہ ہو
صید اس دام میں طاؤسِ جوانی ہو جائے

چمنستاں میں عنادل کا ہوا ایسا تو ہجوم
شاخِ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے

ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم
آشکارا نہ کہیں حالِ شبانی ہو جائے

راہِ مولیٰ میں اگر نظم کو آجائے اجل
گردِ صحرائے نجف بر دیمانی ہو جائے

۱۸۹ ——— ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے
مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے

دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں
دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے

چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے
سر بھی شمشیر بھی ہے پا بھی زنجیر بھی ہے

منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آپ
دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے

دل مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا
زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے

خونِ ناحق کو بھلا حشر میں کرتے تو ہی
تیغ دھیما بھی قزاک بھی نخچیر بھی ہے

کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست
دیکھنا بخت جو اس بھی فلک پیر بھی ہے

ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلہ و تزویر بھی ہے

لے بچے جان اشارے مژہ و ابرو کے
کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدفِ تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہے منظور اسے آرائش بھی
اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سبب غفلت اہل عالم
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چاک کرتم کو گنہ گار ہوا نظم حزیں
قابل قتل بھی ہے لائق تعزیر بھی ہے

۱۹۰ ——— ۱۶

لے کے ساغر سر و پا کا نہ رہا ہوش مجھے
کر دیا منکر دو عالم سے سبکدوش مجھے

ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے
طبع رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے

میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہے اکثر
کر دیا داغ غم عالم نے سیہ پوش مجھے

بزم عشرت میں جو آجائے وہ مست اسائی
میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے

کہہ رہا ہے یہی نقش خط پیمانۂ جم
پی گئے گھول کے رندان قدح نوش مجھے

کھول کر میں گرہ زلف پشیمان ہوا
نظر آیا وہ ستم گار زرہ پوش مجھے

عہد پیری میں ہوں وہ شمع مزار حسرت
کہ نسیم سحری کر گئی خاموش مجھے

دیدۂ تار دل ہے پھر آج گہہ حیرانی
ہائے اے پیر مغاں آگیا پھر ہوش مجھے

ہو جو ممکن تو رگ جاں میں گرہ دے رکھوں
کہ تیری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے

عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں
شب گیسو میں ہوئی صبح بناگوش مجھے

خوف یہ ہے نہ کہیں وار اجل کا چل جائے
جھرمیاں کہتی ہیں پیری میں زرہ پوش مجھے

الفت مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے
کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے میں صدقے کہ دیا ہے زاہد
دل افسردہ تجھے خاطر پرجوش مجھے

بادشاہی تھی گدائی درِ میخانہ کی
کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے

نقشِ حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پڑھ کر چشم
حرفِ عبرت ہوں بنایا نہ درِ گوش مجھے

پرسشِ حشر سے اے نظم بچالے گی ضرور
اوس کی درگاہِ عطا پاشِ خطا پوش مجھے

۱۹۱ ۵

دیکھے وہ زلفِ کمر تا قدر غ دیکھے
جس کے آگے تو خرامانِ وہ کیا کیا دیکھے

کس کو وہ دیکھے ترا جو رخِ زیبا دیکھے
چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے

کوئی کب تک دلِ ناداں تماشا دیکھے
روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے

خیر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہونے دو
میں سمجھی کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے

شکوہ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا
میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے

دیر سے حور ہی ساغر بکفِ وعشوہ نما
آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے

میری بیتابیِ دل کی ہو اونہیں کیا پروا
جن نگاہوں نے وہ عالم تہ و بالا دیکھے

شام ہی سے غمِ فرقت میں مرے جب
کیوں جیے اتنا جو طولِ شبِ یلدا دیکھے

تھا کرشمہ یہ شبِ عیش کی کوتاہی کا
صبح اور شام کو یوں تو کوئی یکجا دیکھے

بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ
چھیڑ دے کوئی خدا اور تماشا دیکھے

زاہدِ خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا
سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
کچھ دنوں کھائے ہوا دشت کی صحرا دیکھے

ہو جسے مثل حباب ایک نگہ کی فرصت
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی دنیا دیکھے

چاہیے دہر میں دو عاقبت اندیش نظر
جو کہ امروز کو آبستن فردا دیکھے

جوش گریہ ہے علاج غم دیوانۂ عشق
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ ——— دلہ ——— ۲۱

جلوہ کن بیکسوں سے ترے فرمانے سے
کیا کمی ہو گئی تمنا مری برلانے سے

سرکشی نفس کی ہے باعث بیتابی دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

آنکھ تھی محو تماشا گری اک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

عقدۂ سر حقیقت نہ ہوا حل اب تک
گتھیاں اور بھی پڑتی گئیں سلجھانے سے

قید ہستی گرو سلسلۂ تار نفس
زندگی ہوتی ہے زنجیر کے ٹھہرانے سے

رو لے جی بھر کے پہاڑوں سے نکل کر اے دل
فائدہ کیا سر شوریدہ کے ٹکرانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفس بد خو
شعلے اوٹھنے لگے آخر ترے بہکانے سے

دیکھ کر جلوہ جاناں میں ہوا گم ایسا
آپ کو پا نہ سکا آپ میں بھی آنے سے

چشم بینا کو نظر آتے ہیں اسرار نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید مثال
ذروں میں مہر کی تصویر اتر آنے سے

دیکھ لے کوٹھری کا جل کی ہے منانے دنی
لے نجات ابدی بچ کے نکل جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ دل زندہ کے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کملانے سے

دے چکا بندے کو اندوہِ جہاں وہ پہلے
اصل قیمت کو سمجھ لیجئے بیعانے سے

اپنی دنیا تو بنا لی تھی ریاکاروں نے
مل گیا خلد بھی اللہ کو پھسلانے سے

واورِ حشر گنہ گاروں سے پرسش کیسی
فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

اوس طرف عرش کے ہے منزلِ مقصود اپنی
رہ گیا میں کششِ ارض میں آجانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت نری ہم نے ساقی
بادہ کم ہوتا نہ کچھ جام کے چھلکانے سے

آکے تو بیٹھ یہاں کام نہیں ناصح کا
میں سمجھ جاؤں گا سب کچھ ترے سمجھانے سے

کرسیٔ عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر
داوری گاہِ عدالت میں جگہ پانے سے

اوجِ یہ مجلسِ اعلیٰ کی سفارش سے ملا
اور سلطانِ حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳

وہ تھے ہم کو بہت ذکر پرستاروں کے
سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے جھلکتے ہوئے پیمانوں کے
بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گرد میں قافلۂ نکہتِ گل کی سمجھا
دیکھ کر رنگِ مدہ کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برقِ صدا کے مطرب
نغمے نہیں شعلے ہیں زبانوں کے

بارِ خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طولِ امل
پیش نجاؤں میں کہیں بوجھ ہیں ارمانوں کے

پتلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے
ہاتھ پردے میں رہے سلسلہ جنبانوں کے

قدرتِ نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس
ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے

بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا
چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے

لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو
پھرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے

ڈال دی نالۂ پر درد نے اون پر بھی کمند
کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے

ہیں حوادث بھی زمانے کے وہ اعجاز رقم
نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے

نکل آشوب سے اس ہفت فلک کے بچ کر
کچھ بگولے ہیں سرِ راہ بیابانوں کے

آزمانے کو جو بنائے زمانہ کی چلا
دیدہ بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ارباب کمال
حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے

خوانِ نعمت پہ ہجوم اہلِ ہوس کا ہے عبث
من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے

بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا
رہ گئے دام جو کچھ تھے گریبانوں کے

جلد اے بادِ مراد آ کہ ہے کشتی اپنی
منہ میں گرداب کے آشوب ہیں طوفانوں کے

کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ
خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے

اوس کی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں
لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا پروانوں کے

مجھ کو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں
اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے

ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کئے ہیں وہ کام
کارنامے جو تہمتن کے ہیں میدانوں کے

ایسے دروازہ کو بس دور سے ہی اپنا سلام
جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے

ہیبتِ عدلتِ دولتِ عثمانی نے
شیر میں لرزہ بر اندام نیستانوں کے

چاہیے عرش کے مضمون غزل میں نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پرستانوں کے

۱۹۴

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتے جو آنکھوں میں لڑائی ہوتی

دے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داؤ پر دولت کونین لگائی ہوتی

راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہے کو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داور محشر کے کرتے پھر آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط بیتابی دل نے جو بنایا تھا حصار
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہو شرر رشک میں جس طرح قفس میں ہوں
یہیں رہ جاتا تڑپ کر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے وہ
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر تو اے دشت جنوں
شیر سے وادی وحشت میں لڑائی ہوتی

توبہ جب کر چکے ہم ابر اب آیا بھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی بنا کر اے خضر
چھاؤنی عالم فانی میں چھائی ہوتی

اوج عزت نہ گراتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوس ناصیہ سائی ہوتی

رشک نے رک سکا خیر ہوئی یہ ورنہ
اس پتنگے نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید برآئی ہوتی

حسن جو ہوتا ہے بندش میں وہ مضموں ہیں کہاں
بڑھ کے سونے سے ہے قیمت میں گھڑائی ہوتی

کاغذِ بادِ رہا دستِ ہوس میں دل زار
آرا ہو جاتا یہ نکمن جو چھڑائی ہوتی

گر پڑا پاؤں پہ کوئی تو کہا ٹھکرا کر
لوگ بیٹھے تھے ذرا شرم تو آئی ہوتی

تو نے احسان جو اٹھایا تھا کسی کا اے نظم
آنکھ پھر سامنے اوس کے نہ اوٹھائی ہوتی

۱۹۵ ولہ ۱۲

جان جاتی رہے شکوہ نہیں کرنے والے
کیا جگر رکھتے ہیں دمِ عشق کا بھرنے والے

پھیر تو لی ہے نگہ اس کی خبر ہے کہ نہیں
مل گئے خاک میں نظروں سے اترنے والے

مضطرب ہو زشبِ غم میں ستاروں تو دیکھ
کیسے خاموش گذرتے ہیں گذرنے والے

روح پھونکیں تنِ بیجاں میں کچھ آسان نہیں
کیا مسیحا بھی ہیں دمِ عشق کا بھرنے والے

کوئی موسیٰ کی طرح طالبِ دیدار تو ہو
اپنے عاشق سے وہ پردہ نہیں کرنے والے

آفتوں کا ہے یہ گھر دم بھی نہ لینے کو ٹھہر
اتنا وقفہ بھی مناسب نہیں مرنے والے

ایسے بیزار گئے لوگ جو دنیا سے گئے
اب ادھر بھول کے بھی رخ نہیں کرنے والے

نصرتِ حق جنہیں موسیٰ کی طرح ہے منظور
کسی فرعون سے ہرگز نہیں ڈرنے والے

طالبِ منزلِ مقصد ہے مرا شتِ عبا
ساتھ لے لے مجھے رستہ ہے گذرنے والے

موجِ خیزِ غمِ الفت کا تلاطم تو یہ
غوطے کھا جاتے ہیں پانی پہ ٹھہرنے والے

خونِ ناحق کہیں چھپ سکتا ہے ہم دیکھیں گے
حشر کے دن تو مکر جائیں مکرنے والے

زیست ذلت کی ہے مر جانے سے بدتر بخدا
کچھ خبر بھی ہے تجھے موت سے ڈرنے والے

۱۹۶ — دل — ۱۲

شمع خورشید ہے اس بزم میں جلنے کیلئے
چرخ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کیلئے

غم ہے بے صبر کلیجہ مرا ملنے کیلئے
اشک بیتاب ہیں آنکھوں سے نکلنے کیلئے

پاؤں بہکا تھا مگر نشہ میں بہکی نہ زباں
نام ساقی کا لیا گر کے سنبھلنے کیلئے

موت ہی نے شب ہجراں میں بہت کی تاخیر
ہم تو بیٹھے تھے بڑی دیر سے چلنے کیلئے

اتنا اطلس کی قبا پر نہ نازاں طاؤس
ہائے نازک بھی تو ہوں ناز سے چلنے کیلئے

یہ سمجھ کر سر رہ ہم نے بنایا ہے مزار
تم کبھی تو نکل آؤ گے ٹہلنے کیلئے

سہ کے ایذا دل نازک کو بنا لے پتھر
کام آئے گا یہ موذی کو کچلنے کیلئے

دل لگایا ہے تو آنسو نہ بہاؤں کیونکر
نخل کو سینچتے ہیں پھولنے پھلنے کیلئے

پوچھے دشمن سے کوئی میرے قلم کا انداز
ہے یہ اردو زباں زہر اگلنے کیلئے

دل ہو بیتاب تو یارب ہے طاقت مجھ میں
دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو مسلنے کیلئے

دامن یار تلک ہاتھ نہ پہنچا نہ سہی
دل تو پہلو میں ہے سو ہاتھ اچھلنے کیلئے

ہے یہ بالوں کی سفیدی خبر مرگ اے نظم
دھوپ دیوار پہ چڑھتی ہے تو ڈھلنے کیلئے

۱۹۷ — دل — ۱۱

کینیوں تک مرا یہ بے کے لہو آتا ہے
کیا نہیں آتا ہے کافر کو وضو آتا ہے

حال

اوس کو جو کوٹھی پہ دیکھا ہی تو ہی دل کا یہ
جب اوچھلتا ہے لب بام کو چھو آتا ہے

نشۂ مے سے ہے لغزش قدم ساقی میں
جھونکے لیتا ہوا محفل میں سبو آتا ہے

کوئی پوچھے تو سہی قتل کیا ہے کس کو
منھ چھپائے ہوئے وہ عربدہ جو آتا ہے

قبر میں بہر خدا چین سے سووں کہ نہیں
ہے تم ساتھ جنازہ کی بھی تو آتا ہے

ہیں کدھر رند ذرا جھوم کے چلنا دیکھیں
ابر کہسار سے اوٹھ کر لب جو آتا ہے

بس نہ دیوانے پہ چلتا ہے نہ ہشیار پہ کچھ
نہ تو دل آتا ہے قابو میں نہ تو آتا ہے

کھل گیا اتنو کہ دل میں ہے خلش گانگی
خون اسکوں میں بقدر سر مو آتا ہے

زمزمہ تیرا کس آفت کا تھا ای مرغ چمن
آج کہنکار میں غنچہ کے لہو آتا ہے

لاش بسمل پہ جو ہے شبک فشانی منظور
بال کھولے ہوئے وہ غالیہ مو آتا ہے

نظم اغیار سے کیا قدر شناسی کی امید
کہیں ناکس کو خیال کس و کو آتا ہے

۱۹۸ ——— ولہ ——— ۳۲

نہ مروت نہ مدارانہ وفا آتی ہے
ظلم آتا ہے ستمگر کو جفا آتی ہے

نغمۂ عیش لئے باد صبا آتی ہے
ساغر گل میں مے ہوش ربا آتی ہے

اونگلیاں کانوں میں رکھئے تو صدا آتی ہے
شور کرتی ہوئی اک سیل فنا آتی ہے

رات میں قافلۂ عمر ہے سرگرم سفر
دل دھڑکتا ہی تو آواز درا آتی ہے

شک گذرتا ہے بطمے کی طہارت میں اگر
ایک غوطہ خم صہبا میں لگا آتی ہے

۲۱۵ ہمت کا مصرعہ ۱۰۰۱۱ ہو وقت کے قطار سے ماخوذ ہے

گل نے کیا جانئے بلبل پانی ہے کسکی آواز
کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیرِ گلستاں میں تو مستانہ روی
تو قرابے گل و نسریں کی لنڈھا آتی ہے

موسمِ گل میں ہے جامہ میں سمانا مشکل
ٹھیک آیا ہے گریبانِ قبا آتی ہے

شنوا ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا
سیکڑوں کوس سے آوازِ درا آتی ہے

دشتِ غربت سے پلٹنے کا جو ہوتا ہے خیال
سامنے حیرتِ نقشِ کفِ پا آتی ہے

منزلِ گور ہے اس دشت کی پہلی منزل
دل کے آجانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد
جا کے شیریں اسے آواز سنا آتی ہے

خلوتِ وصل میں آئینگی ہو حیرت کس کو
آتی ہے شرم بھی تو رو تبعا آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں بیٹھے ہوئے دنیا آلگ
ہر نفس میں خبرِ ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد
کچھ تجھے شرم بھی اے مردِ خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر
جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدہ شکر
جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گورِ غریباں کو خدا خیر کرے
تو قیامت بر خاکِ شہدا آتی ہے

دل ہو باتیں شبِ فرقت میں رہیں صبح تلک
اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہے جو کچھ دل کا غبار
جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اوڑا آتی ہے

نہ تھمی عمرِ رواں لاکھ پھڑکتا رہا دل
سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

راحتیں وادیِ غربت میں بھی تو نے بخشیں
چھاؤں ہے سبزہ ہے جنگل کی ہوا آتی ہے

آنکھ جب بڑتی ہی دنیا پہ تو بڑھتی ہے ہوس
جب دریچہ کوئی کھلتا ہے ہوا آتی ہے

ہائے یہ قبر کی گرمی یہ اندھیرا ہے ہے
کوئی کھلتا ہی نہ روزن نہ ہوا آتی ہے

کچھ دنوں تختِ سلیماں تھا ہوا پر اب تو
خاک اوڑانے کو سلیماں کی ہوا آتی ہے

خاک میری ہوئی برباد تو ہو جانے دے
میں تو خوش ہوں تیرے دامن کی ہوا آتی ہے

ہاتھ باندھے ہوئے آئینہ کھڑا رہتا ہے
پاؤں پڑنے کے لئے آپ حیا آتی ہے

چھیڑ کرتا ہی یہ ابرو کہ پڑے گی تلوار
کہہ رہا ہے یہی گیسو کہ بلا آتی ہے

وصل کی رات بھی ہوتی ہی لڑائی اکثر
بار ہا بیچ میں وہ زلفِ دوتا آتی ہے

تیوری چڑھ جاتی ہی فوراً یہ تماشا دیکھو
منتوں سے جو ہنسی اوس کو ذرا آتی ہے

چاند نکلا کرے بڑھ بڑھ کی نکلتا ہی اگر
کہیں اوس میں ترے عارض کی صفا آتی ہے

نظم آزاد ہی اب اور وہ کنجِ خلوت
بار صرصر نہ جہاں بادِ صبا آتی ہے

۱۹۹ ـــــــــ ولہ ـــــــــ ۲۱

پاک کر اشک نہ اے شاہدِ خوش خو میرے
ہاتھ نازک ہیں ترے گرم ہیں آنسو میرے

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
رو کے تسکین نہ پونچھے کبھی آنسو میرے

برچھیاں مار کی اور دردِ جگر چاک کر
پردہ دارِ حرمِ شوق ہیں پہلو میرے

عہدِ طفلی سے جو ہیں سر پہ بلا میں نازل
جانتا ہوں کہ یہ منہ کے ہیں گیسو میرے

دردِ اندوہ سے پڑتی ہی رہی چین و شکن
غم کے ہاتھوں میں کیا دہ رہے ابرو میرے

ہاتھ سے اپنے میری اشک کئے پاک اُس نے
پھیاں موتیوں کی ہو گئے آنسو میرے

پاؤں جھولے سے نکالی تھی کہ سودا لپٹا
عشق بچپن کے شگوفے ہوئے گھنگرو میرے

اوس طرف لی کبھی کروٹ تو کبھی اُس جانب
ڈھونڈتے ہیں کسی محبوب کو پہلو میرے

ہیں گلے میں جو کسی مہر لقا کے باہیں
آج شاخ گل خورشید ہیں بازو میرے

جب میں جانوں کہ ہوئی یکدلی وہمدردی
اون کی آنکھوں سے نکلنے لگیں آنسو میرے

جب بڑھی دست دعا جانب ساقی ازل
بھر گئے بادہ مقصود سے پہلو میرے

جان پہچان نہیں گوشۂ عزلت میں کوئی
روشناسوں میں ہیں آئینہ زانو میرے

دل کو تولے تو مرے حسرت دیدار ذرا
روشنی طور کی دیں سنگ ترازو میرے

آگیا حال مجھے حضرت خوبی کیطرح
آکے چمکا جو کبھی سامنے جگنو میرے

آج پرجوش ہے پرشور ہے بیتابی دل
یہ سبب ہے کہ تلاطم میں ہیں آنسو میرے

سوز غم سے کسی کروٹ نہیں پایا آرام
مثل فانوس خیالی ہے پہلو میرے

کف افسوس ہی مل مل کے گیا کام تمام
خون امید سے لبریز ہیں پہلو میرے

راز ہے کیا گرہ زلف مکمل جائے گا
کوئی مضمون ہیں کہ بندھ جائیں گے بازو میرے

دیکھ کر تاروں کو یاد آتی ہے بزم شب عیش
صبح تک شام سے تھمتے نہیں آنسو میرے

کیا بیان کیجئے بالوں کی سفیدی کا فروغ
عہد پیری میں نہ ہوئے ابرو میرے

نظم اس بزم میں میں شاعر صاحبدل ہوں
دل سے خالی نہیں مصرع کبھی پہلو میرے

رنگ خوں اشک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے
آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے

پر خطر عشق کا صحرا نظر آتا ہے مجھے
خضر اس دشت میں پیاسا نظر آتا ہے مجھے

بندہ اوس زلف میں الجھا نظر آتا ہے مجھے
دہن مار کا چھالا نظر آتا ہے مجھے

نظر عاقبت اندیش اک آئینہ ہے
شکل امروز میں فردا نظر آتا ہے مجھے

نہ فلک دیکھ سکا اے مہ کامل وہ فروغ
ترا منہ صبح سے اترا نظر آتا ہے مجھے

زال و سیمرغ کا مذکور اک افسانہ ہے
دوست اس عہد میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

تو خیاں کیا ہوئیں او خانہ برانداز حجاب
اب تو پردہ ترا گہر نظر آتا ہے مجھے

اس کی رحمت کا ہے جوش اپنے گناہوں کا ہجوم
ایک سیلاب دریا نظر آتا ہے مجھے

کچھ عجب حال ہے دیکھی ہے اوسکی تصویر
نہ اندھیرا نہ اوجالا نظر آتا ہے مجھے

کشتی بادہ لگا دے لب جو اے ساقی
آج کے ابر میں دریا نظر آتا ہے مجھے

غیر آنکھوں میں اوٹرا لے گیا نقشہ تیرا
جب سے چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے

ساغر مے کے سوا اور نہیں اس کا علاج
دل قتیل غم فردا نظر آتا ہے مجھے

آج وہ اوڑھ کے نکلے ہیں دوپٹہ آبی
آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے

بیخودی کو مری کافی ہے یہی اے موسیٰ
کوہ پر لالہ حمرا نظر آتا ہے مجھے

جستجو میں تری اوس دشت میں پھرتا ہوں میں
کہ فلک آبلہ پا نظر آتا ہے مجھے

چشم مژگاں کا تصور ہے جنوں کا ساماں
ان جگروں سے تو صحرا نظر آتا ہے مجھے

بند کی دید نہاں نے پری شیشہ میں
ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے

سن نہ لے وہ نفس بازپسیں کی آواز
جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

دورِ مقصود کا کیا خوب شگوں ہاتھ آیا
کفِ افسوس ہی چھالا نظر آتا ہے مجھے

دعوی جوشِ صفا اور تمہارے آگے
آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے

حسرتِ دید سے جاں آ جو گئی آنکھوں میں
دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے

داغ کو کیوں نہ کلیجہ سے لگائے رکھوں
ایک دل سوز تو اپنا نظر آتا ہے مجھے

اے غمِ یار لہو میرا سکھانے والے
دل میں کچھ خون تمنا نظر آتا ہے مجھے

شہرہ ہی شہرہ ہے ہستی کا یہاں نام ہی نام
بیضۂ چرخ میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

جس جگہ مہرِ نبوت نے شرف پایا ہے
آپ کا نقشِ کفِ پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر
جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

۲۰۱ ——— فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۲

حسن پر خلقِ خدا لوٹ گئی
وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی

چال پر اس کی قیامت اٹھ کر
مثلِ نقشِ کفِ پا لوٹ گئی

درد کی طرح اٹھا میرا غبار
دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی

سیکھے ہم سے کوئی اندازِ سوال
عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی

بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا
قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی
ساتھ سنبل کے قضا لوٹ گئی

وہ جو مستانہ چمن سے گذرا
شاخ گل موج صبا لوٹ گئی

دیکھنا جذب دل زار مرا
کشمش کا ہر بالوٹ گئی

واہ رے حسن برو دوش و کمر
دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی

چھاؤں آئی ترے کوچہ میں کہ دھوپ
خاک پر مثل ہما لوٹ گئی

چاندنی تا سر دیوار آ کر
دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر ترے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

۲۰۲ مفاعلن فاعلن فعولن دو بار ۲۲

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دار الاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانہ یہاں نہیں ہے

وہ عندلیب اسیر ہوں میں جسے کہ اذن فغاں نہیں ہے
قفس میں نقش و نگار کیا ہوں نفس ابھی خونچکاں نہیں ہے

کبھی نہ کیں میں نے دل سے باتیں کہ یہ مرا راز داں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہمزباں نہیں ہے

یہاں سے جانے کا نام آنا فریب میں دیکھ آنہ جانا
طلسم ہے رہ گزار ہستی غبار ہے کارواں نہیں ہے

نہ جذب وہ کہربا میں پایا نہ رنگ و بو سا خا میں پایا
کہاں کہاں میں نے جا کے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نجانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پریدہ میں تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبحِ عمد پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات اپنا مذہب
جہاں کے ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثباتِ عالم ٹھہر کوئی دم تو او رشبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لامتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسرِ طائر میں خط ساغر میں ڈھونڈ لیتا
اگر یہ پیرِ مغاں کہتا کہ یہ خطِ کہکشاں نہیں ہے

برا جو کہتا ہی کہے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کسی سے دل میں ملال رکھنا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آ کر یہ میں نے جانا ہی اتفاق اصل شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی ہیں مل کر یہ نہر آب رواں نہیں ہے
کمند موج شعاع پا کر چلی سوائے اوج مہر شبنم
سپند رہ رہ گیا تڑپ کر کہ دل دل نردباں نہیں ہے
یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا
وہ سامنے لامکاں نہیں ہے وہ حلقہ کہکشاں نہیں ہے
جھلک دکھا دی تھی کس نے اپنی کہ جوہروں میں تھا اک تلاطم
فضائے آئینہ ہے اودا اس اب وہ طوطی پرفشاں نہیں ہے
نہ اف کرو نگاہ کی دیکھو چھری جگر پر لگا کے دیکھو
مجھے ملال ستم نہیں ہے مجھے مجال فغاں نہیں ہے
نگاہ آبستن ہوس ہے ہوس ہے آلودۂ منائی
تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے
ہلاک ہو ذکر کو اے مسافر چلا شب تار میں کدھر تو
کہ غول صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتش کارواں نہیں ہے
بھلا ہو نادان واعظوں کا کہ میکدے کو کیا ہے رسوا
وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے
مقام تسلیم میں پہنچ کر اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا
سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں دھوپ چھاں نہیں ہے

یہ کسی اے نظم چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ مفاعیلن مفاعیلن فعولن ۳۲

بھر اساقی کس آبِ آتشیں سے
کہ چھلکا خون رنگِ ساگیں سے

یہ کاوش خارِ صحرا اور ہیں سے
چھٹا دامن تو الجھا آستیں سے

فلک شرما گیا اس کی جبیں سے
بنائے چاند زلفِ عنبریں سے

کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر
اجازت لو نگاہِ شرمگیں سے

فلک دیتا رہا سرمایۂ دہر
نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے

کشیدہ رہ نہ یوں اے دامنِ یار
لٹکنا سیکھ زلفِ عنبریں سے

مبارک نیم بسمل ہو کے مرنا
چھری پھرتی ہے دستِ نازنیں سے

قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے
اوسے مارا نگاہِ واپسیں سے

سفر کا میرے قصہ مختصر ہے
کہیں جاتا ہے آیا ہوں کہیں سے

بہت نازک ہے اے ناصح مرا دل
کہیں ٹوٹے نہ حرفِ دل نشیں سے

پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر
یہ عادت سیکھ لی ہم نے کہیں سے

بتا کس خوں گرفتہ پر غضب تھا
لہو ٹپکا نگاہِ خشمگیں سے

سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے
کہ جھک کے توڑتا ہے زمیں سے

شرارِ عشق دامن جھل گئے بھڑکا
چراغِ عقل گل کر آستیں سے

خوشی میں بھی نکالے غم کے پہلو
خدا سمجھے دلِ اندوہ گیں سے

اٹھائی آنکھ اس نے اور نہ دیکھا
نہ سنبھلا جام دستِ نازنیں سے

یہ شاخِ گل ہے اے بلبل کہ صیاد
کہاں لے کر نکل آیا کہیں سے

بھلا محشر میں کیا واعظ سے امید
گنہ گار اس نے ٹھہرایا یہیں سے

کھلا یہ سابقہ کے بعد ناصح
کہ حضرت آپ بھی ہیں کچھ یونہیں سے

سخن جب اصل ہی میں بے نمک ہو
تو کیا ہوتا ہے شورِ آفریں سے

عطائی دہر سے یوں ہاتھ کھینچا
شکن نکلی نہ اپنی آستیں سے

کہا میں نے قیامت ہو تو بولے
یہ مردہ کیا نکل آیا زمیں سے

عجب آزاد ہے دیوانۂ عشق
نہ دنیا سے غرض اوس کو نہ دیں سے

تری قربت کا اک زینہ ہے معراج
وہ منزل دور ہے عرشِ بریں سے

اشارہ تیری رحمت کا اگر ہو
لڑوں کشتی کراماً کاتبیں سے

وہیں ہو خارزارِ ای چرخِ افسوس
چمن پیدا ہوئے جس سرزمیں سے

بلا انگیز ہے خالِ رخِ یار
زحل اوترا ہے چرخِ ہفتمیں سے

خیالِ خال باندھا دل میں میں نے
ستارہ دیکھا ہوں فروریں سے

یہاں کس کو خبر دورِ فلک کی
کسے فرصت ہے دور آسمیں سے

تعلی اہلِ رفعت نے نہ چھوڑی
گئی گردوں تک خاک اوڑ کر زمیں سے

نگاہِ مست نے رسوا کیا ہے
اوٹھا طوفان موجِ آستیں سے

جلا اے نظم آئینہ پر اپنے
ہوی گرد نگاہِ عیب بیں سے

۲۰۴

خیالِ چشمِ فتاں ہر گھڑی ہے
لبِ اوس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
چلو صحرا کو یہ دہن ہر گھڑی ہے
یہ غرہ زلف و رخ پر یاد رکھنا
نہیں رنگِ چمن کو پائیداری
دلِ غمگیں مرا وہ کربلا ہے
نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
گھلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
لحد تک پھر تو ہے پیری ہی پیری
مجھے مار اتری اس نازکی نے
وہ آئے نزع میں بالیں پہ میری
یہ نہیں رہنے دو مجھ کو غم بسمل
بھلا تم اور چراؤ دل کسی کا
ملے جائیں یہ منہ مانگی مرادیں

۲۰۴

اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے
گراں جس پر کہ مسی کی دھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے
کبھی کا دن کبھی کی تب بڑی ہے
یہ سمجھو فصلِ گل اک پھلجھڑی ہے
کہ لاشِ آرزو جس میں گڑی ہے
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے
سروی جب پڑی اوجھی پڑی ہے
یہ ساعت نیک ہے اچھی گھڑی ہے
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے
سراسر جھوٹ ہے اور دھڑی ہے
کہ رندوں پر تری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہے وہ
مجھے تیری فقیری بن پڑی ہے

الٰہی تو دل بے آرزو دے
مجھے حسرت میں حسرت یہ بڑی ہے

مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ
اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے

جہالت میں سلوکِ راہ عرفاں
اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے

میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا
کہ بانا عاشقی کا ہتھکڑی ہے

نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر
قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے

متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے
یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے

گناہوں کی گھٹا لے جائیں گے ساتھ
سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے

نہ ہو ہزار مجھ سے تو تو اے قبر
مری صورت گلی ہے باسڑی ہے

وفا کہتی ہے اب حیدر سے مل جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

۲۰۵ ——— ۱۹

وہ آئی فوجِ گل وہ برق چمکی
وہ اڑتی آتی ہے بیرق علم کی

مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی
بھلا ہو خیر ترے دم قدم کی

یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی
کہ رامیں بند ہیں دیر و حرم کی

نہ دیکھ اے نقشِ پا دن شوخیوں کو
تری آنکھوں میں خاک اوسکے قدم کی

فلک کے کھلا رہا ہے لالہ و گل
یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے
چلیں گے برچھیاں لاؤ نعم کی

مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر
ہوا ہے گرم دامانِ کرم کی

ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام
خرابی کی ہے جس نے ملکِ جم کی

جو میری طرح سے کھینچا دمِ سرد
تو سانس اوکھڑی نسیمِ صبحدم کی

نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں
کہ گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی

نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا
کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی

وطن کو مڑ کے غربت میں جو دیکھا
تو اک زنجیر تھی نقشِ قدم کی

یہ دل ہے اور تیری عشق کا داغ
قسم ہے مجھ کو قندیلِ حرم کی

عطا چھنتی ہے تو چھن جائے لیکن
ادا چھنتی نہیں اہلِ کرم کی

رہائی دامِ گیسو سے ہوئی یوں
چھٹیں نضیں اسیرانِ ستم کی

وہ دل آفت زدہ وہ کوچۂ زلف
وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی

گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے
پشیماں ہو کے بھی گردن نہ خم کی

ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو
قسم کھاتے ہیں وہ جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کو اے نظم
کہ ہے کالی زباں میرے قلم کی

۲۰۶ ـــــ غزل مشاعرۂ یمین السلطنۃ ذوالوزارتین دولت آصفیہ ـــــ

چہ سامانِ سیہ کاری نہ کردی
ولے کردی و پنداری نہ کردی

دریں گلشن بسانِ نکہتِ گل — ز خود رفتی و خودداری نہ کردی
درش از سجدۂ تو دور تر بود — باندازہ نگوں سازی نہ کردی
سرت بار معاصی بر نتابد — چرا فکرِ سبکساری نہ کردی
غلاف از آبروے عشق ازیں بس — چو برخ اشک غم جاری نہ کردی
ازیں خوابِ گران غفلت آے آے — تو گاہے قصد بیداری نہ کردی
بریں عقلِ تو واعظ آفریں است — کہ غم خوردی و میخواری نہ کردی
من از تو ایں سخن باور نہ دارم — کہ دل بروی دل آزاری کردی
خراک اللہ کہ رازِ عشق را فاش — تو در مستی و ہشیاری نہ کردی
عفاک اللہ کہ دریں کوچۂ عشق — لحاظِ ذلت و خواری نہ کردی
شدہ رازِ عطایت فاش اے شاد — کہ پنہانش ز بسیاری نہ کردی

خدا بودہ است آمرزندہ اے نظم
نہ کردی بیش او زاری نہ کردی

۲۰۷ مفاعیلن چار بار ۱۴

تہ جی بہلا مرا بوئے گل و رنگ گلستاں سے
رہا آوارہ مثلِ گرد باد اٹھ کر بیاباں سے
نگہ بے باک بکھری کا کلیں سر کا ہوا آنچل
لڑا نا اس طرح آنکھ آئینہ کی چشمِ حیراں سے

غلامی کرکے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے

ہوا سے کھل رہے تھے پھول یہ ماجرا دیکھا
کہ جاتے ہی ترے اوٹھے لگے شعلے گلستاں سے

تڑپ تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد اوٹھنا سیکھ طوفاں سے

جہاں فانی ہے لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجودِ سایہ ہو جس طرح خورشیدِ درخشاں سے

ہوا دل غم سے پھر اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگِ لرزاں سے

مجھے نشو و نمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے

عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آئے
یہ بادل ہے کہ سرمہ اوڑ کے آیا ہے صفاہاں سے

میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں دیوانہ
بنھائیں طوق اوسے گھٹتا ہو دم جس کا گریباں سے

ادب کا ہے تقاضا ہاتھ میرے باندھ دے کوئی

انہیں خو ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے
نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پر
تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے
بسانِ سیل ہم قطعِ تعلق کرتے رہتے ہیں
بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے
پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی
کہ دردِ سر نہ خمیازہ چاک گریباں سے

۱۷ ولہ ۲۰۸

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے
کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے
ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے
گہر ریزی مرے خامہ نے سیکھی ابرِ نیساں سے
ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے
کہ میں واقف ہوں تحلیلِ شعاعِ مہر تاباں سے
سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں
نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے
غلط ہے اس سرائے راہ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گرد جولاں سے
اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا
تلاطم پڑ گیا ہے جنبشِ دامانِ مژگاں سے
نہ انسان کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا
زمیں میں گڑ گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے
کئے دیتی ہے بیخود بوئے گل ہاتھوں میں رعشہ
سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے
شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے
کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے
رخِ روشن پر اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا
عروجِ ماہ میں اوترا یہ تارا اوجِ کیواں سے
پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ پریدہ کا
غرض کیا طائرِ شبگرد کو فکرِ شبستاں سے
درِ اہلِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں
صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے
ٹھکانہ اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا
کدھر جاتا ہے دیکھیں گرد باد اوٹھ کر بیاباں سے

غبارِ رہ گزر سے رہروؤں کا ماجرا سن لو
خبر اوڑتی ہوتی آئی ہے کچھ شہرِ خموشاں سے

مجھے بے صبر کیوں کہیے خطا رشکِ خوں کی ہے
کہ عادت ہے ٹپکنے کی اوس کو نوکِ مژہ گاں سے

صدف کا سا جگر رکھ تو ہو آبستن گوہر
شکایت نگریزوں کی عبث ہے ابرِ نیساں سے

زباں کج مج ہے اور دعوی ہمیں رنگینِ خیالی کا
شفق پھولے گی اب کے نظم خونِ گرمی دہقاں سے

۲۰۵ ولہ ۴

رعایا خوش ہے شہ کے بذلِ ظاہر فیضِ پنہاں سے
پہنچتی ہے طراوت خشک و تر کو فصلِ باراں سے

کئے ہیں انتظام ایسے ہوئے ہیں انتخاب ایسے
دکن کے پھر گئے دن عہدِ عثمان علیخاں سے

عجب کیا ہے زمینیں بے چراغ آباد ہو جائیں
یہ سنتے ہیں گزرنے کو ہے دجلہ اب بیاباں سے

عجب کیا ہے سنا کر رعبِ سلطانی کا افسانہ
رسن میں باندھ کر شیروں کو لے آئیں نیستاں سے

۲۱۰

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب پہلی منزل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو چل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہے ایک اتنا سا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی نکل سے پھر نکلے بھی مشکل سے

ریاضت کشت زار آرزو کی سعی بے جا ہے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتی عمر رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحر فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
ملا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھ اے فلک ہے تیرے گشتہ کی تماشائی
ستارے جھلملے ہیں آئینہ داری مسلسل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

۲۵

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزم عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنوں صوت عنادل سے

میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے

شب غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے

ذرا تو ہی بتا دے اب کدھر جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے

حدی خواں دیکھنا ایسا نہ پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتے ہیں محمل سے

غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مدمقابل سے

کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہل مروت کو
کبھی جھکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے

جو ہیں بیدرد ان کا ذکر کیا جو چاہیں وہ سمجھیں
تراوش وجد کی بھی ہے پرافشانی بسمل سے

بڑے ہشیار ہیں اہل کرم بھی میں تو قائل ہوں

کہ جو دیتے ہیں اوس سے بڑھ کے لے مرتے ہیں سائل سے
بہانہ ہو گیا ہے اوستگر برق خرمن کا
نجانے آہ نکلی تھی یہ کس دکھتے ہوئے دل سے
ہمیں یہ بھی نہیں اب یاد حسرت کتنے ہیں کس کو
نہ آئی تھی کبھی دل میں نہ نکلی تھی کبھی دل سے
مرے غم سے کہیں احباب بھی غمگیں نہ ہو جائیں
یہی رہتا ہے اندیشہ کہ دل کو راہ ہے دل سے
رہی جب ناخن تدبیر میں باقی نہ گیرائی
کھٹکتی ہے جگر میں پھانس اب نکلی تھی جو دل سے
مکرنے میں ہے ظاہر تیرے چہرے سے پشیمانی
زباں سے قتل کا انکار ہے اقرار ہے دل سے
مرے پہلو سے آخر اوٹھ گیا وہ بدگماں ہو کر
تڑپ جائیگا شکوہ دل کو ہی مجھسے مجھے دل سے
نہ جو بات دل سے کچھ مزہ اوس میں نہیں آتا
محبت چاہیے دل سے عداوت چاہیے دل سے
خدا ہی نظم کا حافظ ہے اب کہدو یہ حافظ سے
شب تاریک بیم موج کشتی دور ساحل سے

۲۱۱ | ۱۵

نہ قصر و لکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے
بڑی جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے

غرض اس پیر زال دہر سے کس کی بلا رکھے
نہیں ہیں ناز کش اس کا یہ ناز اپنے اوٹھا رکھے

رگ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھک کے مل اوس سے
یہ وار ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے

غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگائے خون دامن میں کہ ناخن پر حنا رکھے

وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انسان
وہ ناظر ہے جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے

گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا میرے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے

یہ کہہ کر ہاتھ دنیا سے اوٹھایا اہل ہمت نے
مناسب ہے وہاں کے واسطے بھی کچھ اوٹھا رکھے

تری سرکار سے میں ہی قناعت فیض کو پہنچا
تجھے اللہ ساری خلق کا حاجت روا رکھے

فقط دو قرص ناں ہیں نعمت خوان پیر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم یہ با دپا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آئیگا نہ منعم کے
جسے خود کھو دکر گاڑا ہو امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت آیا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جانا ہے
بشر کا ہیکو دو دن کے لئے جھگڑے لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو جفا کا رکھے

ولہ

۲۱۲ | ۱۱

میں ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میں احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہ گذر رکھے

یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے

جو محرم ہو نہ راہِ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے

نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے

سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاؤں کیوں رکھو کہ وہ قدموں پہ سر رکھے

دبستانِ وفا سے پڑھ کے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے خود یا کسی کو اپنا کر رکھے

کبھی ششدر نہ ہو اس تختۂ نرد دہر میں پھنس کر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے

صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پرفشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے

بہت سے دل میں ہیں مضمون جو اب آتے جاتے ہیں

مناسب ہے، مجھے بھی ساتھ اپنے نامہ بر رکھے
قدح کش نظم ہے لیکن نہ ایسا بھی کہ اے واعظ
شراب کہنہ و نخوت شیشۂ توبہ میں بھر رکھے

۱۵

۲۱۳

ملا تھا ایک ساغر زہر غم سے نیلگوں وہ بھی
تم ہے اوس پہ تعزیر اے فلک خط سے فزوں وہ بھی
اثر ہوتا نہ ہرگز اہل دل پر صور محشر کا
صدائے چنگ ہو گی یا صدائے ارغنوں وہ بھی
بہار باغ اک ہنگامہ ہے چاک گریباں کا
جسے ہم جوش گل سمجھے تھے ہو جوش جنوں وہ بھی
نگیں کو ناز تھا جوہر پہ اپنے اور زیبا تھا
ہوا ہے نام کی خواہش میں لیکن سرنگوں وہ بھی
ہدف ہونے سے دل کو کس طرح کوئی بچا لیتا
نگاہ اس کج ادا کی اور نگاہ پرفسوں وہ بھی
تڑپ کر دل جو رہ جاتا تھا پہلے رہ تو جاتا تھا
غنیمت تھی مجھے اک فرصت صبر و سکوں وہ بھی
فغاں کرنے پر اوس وادی میں تیشہ بھی ہے آمادہ

چھپے رہنے سے دل میں بن گئی سوزِ دروں بھی
جہاں ہے وارِ ماتم شیوۂ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کہے جاتی ہے لیکن حرص میری یہ بھی لوں وہ بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکب طالع
ہوا آخر شکارِ پنجۂ نخجیر زبوں وہ بھی
کسی عیار نے باتیں سنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب دادخواہی کی ہوس اے داورِ محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے روزِ سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارۂ دشتِ جنوں وہ بھی
کہوں قصہ میں واعظ عنفوانِ نوجوانی کا
حدیثِ عیش و قرن کہتا تھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرف تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشک خوں وہ بھی

۲۱۴ ۱۳

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تو نے کیا نشانی کی

صدا یہ آ رہی ہے دور سے برگ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی

کسی پر دل کا آنا موت تھی عہد جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی

کرامات صفا سے قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شرقستاں لے اوڑی اک بوند پانی کی

تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوندھ ایسی تھی آنکھوں میں برق لن ترانی کی

غبار اوٹھ کر مرا منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی

کوئی حد بھی ہے پستی کی ہزاروں سال جب گزرے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعر لے بیانی کی

بگولوں میں نظر آتی ہے خاک و باد کی کشتی
عیاں ہے برق و باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سے میں نے بدگمانی کی
حکومت کا فرو ہم نے اوٹھایا بڑھ کے شاہوں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی
خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب ہے
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی
علم رکھتا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہے شہرت درفش کاویانی کی
یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۳۱۵ ولہ ۱۱

بڑا غم ہوگا قتل عاشق ناشاد و مضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے
بھلایا حسن دنداں سے لب نازک کی خوبی کو
بجھا دی آتش یاقوت تو نے آب گوہر سے
خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش ساری دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل ہیں پتھر سے

خدا کے سامنے ہوگا خرامِ ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہلِ محشر سے

گرا دو کی طرح میری پلک چھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھ میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے اے زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوضِ کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابیِ دل کے جو مضموں ہیں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بالِ کبوتر سے

کسی کے شوقِ آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا مشتاق ہے دل آئینہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں اے برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ اور ہنستی ہے اوپر سے

پری تھی آئینہ خانہ میں عکسِ حسنِ دلبر سے
صدا پرواز کی آئی پرافشانی جوہر سے

سنو تم وصفِ مے ہم سے سنا ہم نے پیمبر سے
پیمبر سن کے آئے ہیں زبانِ موجِ کوثر سے

جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائے گا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے

سبک سر ہو کے جو خفت اوٹھائی ہے نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے

کھلا جب سے کہ سب تیرے اشارے کی کرشمے ہیں
جگر کو تیرے اک عشق ہے گردن کو خنجر سے

سنبھل کر ہر قدم راہِ فنا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے

شبِ یلدا مری آبستنِ صبحِ قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشمِ اختر سے

صبا نے اے گل تر کھوئے تیرے حواس آخر
کہا راز نہفتہ فاش اور ہنستا ہے پھر اوپر سے

سودائے دلِ سوزاں سے کیا اسپند کو نسبت
کمالِ ضبط تو یہ ہے دھواں نکلے نہ مجمر سے

کہیں میں ہی نہنگ تیز دندان جانتا ہوں میں
عبث ہے فکر آب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے

جو ہو حاصل دل روشن نہ کر لاف نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آجاتا ہے جوہر سے

غنیمت کیوں نہ میں سمجھوں دل پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۱۷ ولہ ۲۹

شبِ ہجر میں اگر یاد آئے فلک و آفتاب آئے
یقیں ہے خرمنِ تنک تو برقِ اضطراب آئے

شبِ غم میں کسی پہلو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوشِ اضطراب آئے

برنگِ مشک تر بالوں پہ گو رنگ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب و تاب آئے

مروت آئے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہیئے تو سیدھی بات کا اولٹا جواب آئے

روانی عمر کی ہے وادیٔ ہستی میں سیل آسا
حباب و موج کے مانند ہم پا در رکاب آئے

بڑھاتا ہے عبث تو ہاتھ دنیا کی طرف ناداں
خبر لے ہوش کی مٹھی میں کیا موجِ سراب آئے

ترش روئی کی عادت تلخ کامی سے ہوئی پیدا
ہمارے سامنے ہو جائے سرکہ گر شراب آئے

نکلتا ہے اشارہ جھلملانے سے ستاروں کے
ازل کے روز سے لے کر دلِ پر اضطراب آئے

میں کیا جانوں گنہ اے کاتبِ اعمال کتنے ہیں
یہ جھگڑے اوس سے کر جس کو حساب آئے کتاب آئے

عناں گیر اوس کے توسن کا ہو جذبِ شوق اتنا ہو
غبارِ ناتواں تا حلقۂ چشمِ رکاب آئے

تلون کی بھی حد ہے اک نگہ اتنے کرشمے ہوں
حیا آئے حجاب آئے غضب آئے عتاب آئے

ترے کہنے سے میں توبہ تو کر لیتا ہوں اے واعظ
رہا جاتا نہیں پھر جھوم کر جس دم سحاب آئے

ہوائے سرد مہری چل رہی ہے سارے عالم میں

نہ تھرّاتا ہوا وقتِ سحر کیوں آفتاب آئے
فسانہ کی عوض اے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں
اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے
جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرار آسا
سراپا اضطرار آئے تمہ تن اضطراب آئے
ملانا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا
یہ مطلب ہے چھری وہ مارے جس کو نہ تاب آئے
ہوا ثابت یہ جب دونوں کی ہستی اعتباری ہے
نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے
نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے
تڑپ کر برق سر رہ جائے گھر گھر کر سحاب آئے
نگاہِ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر
اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے
نشاطِ عالمِ فانی ہے توام رنج و حرماں سے
سمجھئے چشم پرخوں اوس کو گر جامِ شراب آئے
گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا
کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہے جنت واعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شتاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سے اوٹھائی تو ہے آنکھ اوس نے
مگر چتون یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو مرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گنتے گنتے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شام الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
اوٹھیں اس وقت سو کر جب لب بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سے
اگر آئے تو تھرا تا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے تو سن عمر اور پٹری جم نہیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں یہ اسپ شتاب آئے

ادھر دل میں مرے حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
ادھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سا نہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے

الٰہی دل ہے یا پرکالۂ آتش ہے پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے

ادھیں اللہ اکبر یہ خوشی گھر اپنے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی شباشب بڑھتی جاتی ہے

جدائی میں مرا شاخ خزاں دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے

دباتے جاتے ہیں لالہ کے تختے کوہ کا دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے

احبا گنتے ہیں گھڑیوں کے بدلے میرے نالوں کو
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے

نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے میٹھی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے

بہار گل میں ہے طاؤس آتشباز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے
زمین شعر سے کو نکرا دو ٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ مثل خشکر اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے
نظر آتا ہے صحرا صاف بیٹھے بیٹھے زنداں میں
ہوائی موسم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے
یہاں درگاہ میں ہر روز چلے باندھے جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے
بناؤ ان کا پھیکا تھا بہار آئی نہ تھی جب تک
مبارک ہو انہیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی ہے
بہار آئی ہے کاٹے کھاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں نے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے
گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
مجلس میں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے
مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتی ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے
سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ اللہ رے ناز اون کے
جہاں تک منتیں ہوتی ہیں نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا دو دو دن نہیں ملتا احباب کو
نجانے کس پری رو سے محبت بڑھتی جاتی ہے

ولہ

۲۰ ۲۱۹

بیانِ سوزِ غم کا ہیکو اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا پک جاتا ہی جو غمخوار ہوتا ہے
اوسی پر حضرتِ واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے
دئے جاتے ہیں غیروں کو تم ساغر دئے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سی کیوں اصرار ہوتا ہے
گواہی دیتی ہی چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سی میخوار ہوتا ہے
خطا کرتا نہیں گردوں سی جو تیر قضا آیا
نجانے کسکی چھاتی میں کب سوفار ہوتا ہے
ستم کا تیرے میں اے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں انداز نگاہِ یار ہوتا ہے
اوسی دن سی ہوں ای برق تجلی منتظر تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تھا مزہ عہدِ جوانی تک
گئی فصلِ جنوں اب دردِ دل بیکار ہوتا ہے

مجھے ظلِ ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایۂ دیوار ہوتا ہے

مزہ اس راستی پر بھی رہا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے

جہاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوشِ ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے

ہوا و ابر و بحر و بر یہ سب تیرے خزانے ہیں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے

تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں ہے آساں ہے
مجھے آساں سے آساں بھی دشوار ہوتا ہے

اگر دنیا سے استغنا ہو مر رہنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے

کھلا یہ رمز تاب آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب دیدار ہوتا ہے

گذرگاہِ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گر دریا رواں کہسار ہوتا ہے
قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے
حذر اے آسماں کہ نامرادوں کے تسانی سے
اولجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے
صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے
رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے سد رہ بت خانۂ پندار ہوتا ہے

۲۱

۲۲۰

پھنسا دینگے غزالانِ حرم اپنا حرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمندِ طرۂ زلفِ رسا پہلے
طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ کب تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے
نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حالِ عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے
ہوئی ہے صبح کیا جلد آج کی شب وہ جو مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جسکی نہ تھی کچھ انتہا پہلے
بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا
بہار کباد کی دے شیشۂ توبہ صدا پہلے
نجانے کوئی چلہ نکلے یا ہو عیش کا ساماں
گلے کا ہار ٹوٹے پہلے یا بند قبا پہلے
خدا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو
سر بالین تربت شمع سے آئی ہوا پہلے
شب فرقت میں کی اس رشک عیسیٰ نے مسیحائی
سحر کی دے گئی مجھ کو خبر باد صبا پہلے
مجھے اب تک نہیں بھولا تصور دست رنگیں کا
تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا رنگ حنا پہلے
تہیا اے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا
چلے ہم بھی نکل جانے دے یہ کالی گھٹا پہلے
جواب افسوں طرازی کیں اس کا ہے نہ اس کا ہے
قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا پہلے
زمیں سے کس طرح احباب کے کہنے سے میں اٹھوں
اوٹھانا چاہیے اوس بے وفا کا نقش پا پہلے

اولٹی ہے نسیم صبح آنچل روئے روشن سے
چھپالے مطلع خورشید تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں بیتابیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی دو دو تیر تک آہِ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھ جھنکے برق و باراں کا تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی پی لیا آب بقا پہلے

برا ہوتا ہے دھڑکا ساتھ والو نکے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریاد درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسن روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بند قبا پہلے

شکایت کیسی اولٹی منتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی دیکھئے خود ہو گئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اُسے کیونکر نہ شبنم کے دوپٹہ میں

کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ حیدر رجا بجا پہلے

ولہ

۲۲۱ ۱۲

اوڑا کر کاگ شیشہ سے مے گلگوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں میخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہارِ میکشی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھتی ہے ہوا مستانہ چلتی ہے
ترِ خود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہ بن آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا چٹکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہے جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگِ ہر شاخِ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں نسیم صبح نکہت کس کو جھلتی ہے
تمتع ایک کا ہے ایک کے نقصاں سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہے جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
بنا رکھی ہے غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لیکا آہ کا چھوٹے گا جب تک سانس چلتی ہے
قرار اک دم نہیں آتا ہے خون بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اوگلتی ہے
جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخواروں پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو شیشے وہ کب آتش میں جلتی ہے
نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شب فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے
یہ اچھا شغل وحشت میں نکالا تو نے اے حیدر
گریباں میں الجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

۲۲۲ ——— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ——— ۲۱

ہے تل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے
آنکھوں میں جو رہتے تھے وہ او جھل ہوں نظر سے
پوچھے یہ کوئی چاہنے والے کے جگر سے
آئے ہیں مگر برہمی طبع ہے ظاہر
اغماض سے انداز سے تیور سے نظر سے
کٹ جاتی ہے آخر شب غم ہو کہ شب عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے
ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے
رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے
ہم بھی ہیں کھنچے سرو جو رہتا ہے کشیدہ
سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شجر سے
میں عکس ہوں اور آئینہ ہے گوشۂ عزلت
صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے
ہو جاتا ہے رخسار کدورت کا وہ غازہ
گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے ثمر سے
پائی نہ خبر قافلۂ عمرِ رواں کی
پھر کر گئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے
سو عیب تجھے مجھ میں نہ رکھا ایک بھی منہ پر
شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہلِ ہنر سے
انساں وہی انساں ہے جو مشتاق ہو اوس کا
کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے
اک دم میں بہارِ شبِ عشرت ہوئی آخر
گل ہو گئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے

جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے

عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے

انداز نہ اپنا نگہِ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے

کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے

نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچہ سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھونگا کبھی میں ترے در سے

عزلت تری ہم کو بھی پسند آ گئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے

پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے

اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

نکلا سرِ خورشید گریبانِ سحر سے

۲۲۳ ۲۶

چھائی ہے محبت جو دھواں دھار کسی کی
صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی

عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صدا کے
اک بات اُٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

یوں مر کہ نہ یاروں کہ ہو بھاری ترا مردہ
یوں جی کہ طبیعت پہ نہو بار کسی کی

اچھی بھی گذر جاتی ہے انسان پہ بُری بھی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی

پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہے ستارہ
ہے جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی

کہتا ہے قلم سجدوں میں جبتک کٹے عمر
کیونکر ہو زباں واقفِ اسرار کسی کی

مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی

اوس ترک کا کھینچیں گے گریباں سرِ محفل
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی

سبزہ پہ بکھر جاتا ہے جب سبحہ شبنم
پڑھتا ہے وہ تسبیح لگاتار کسی کی

مرقد ہی پہ بس جا کے تھمے گا فرس عمر
کب ان کو مانے گا یہ رہوار کسی کی

بوسے ترے پیکان کے لیتا ہے کوئی زخم
پہنچی ہے ہنسی تالب سوفار کسی کی

تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا تڑپنا
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی

گرجی ہوئی دیوار ہے زنداں کی ہماری
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی

مرقد وہ جگہ ہے کہ اوتر جاتا ہے سر سے
تاج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی

بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن
تڑپوں گا جو خالی گئی تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فضلِ بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو
آنکھوں میں مروت نہیں اے یار کسی کی

دل سے وہاں باتیں میں کیا کرتا ہوں پیہم
کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی

کاٹوں میں گلا اور نہ گردن پہ چلے تیغ
تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی

پامال کرے شوق سے مجھ کو سرِ محشر
سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی

وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم
دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی

چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو چھپی جاتی ہیں نظریں
اتنی بھی نہ ہو طاقتِ دیدار کسی کی

تم غیر سے ملنے کو کرتی تو ہو لیکن
بھولے سے قسم کھائی ہے سو بار کسی کی

کیا ضبطِ محبت نے گلا گھونٹ کے مارا
فریاد تھی جیسے کہ گنہگار کسی کی

میں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھ اے فتنۂ محشر
ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی

رعشہ سا نظر آتا ہے شاخِ گلِ تر میں
لڑنے پہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

۲۲۴ ——— ولہ ——— ۴

کیا عاشقِ ناشاد کو وہ شاد کریں گے
آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے

یہ تیرا ستانا بھی بہت یاد کریں گے
ماتم ترا برسوں دلِ ناشاد کریں گے

جب وہ کوئی طرزِ ستم ایجاد کریں گے
یاد آؤنگا میں مجھکو بہت یاد کریں گے

رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا پیکان
اے پیرِ مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

۲۲۵ ——— مفعول مفاعیلن دو بار ——— ۱۸

یہ ذوقِ تماشا کا حاصل نظر آتا ہے
اندھیر اب آنکھوں ہی تا دل نظر آتا ہے

تو آپ ہی اپنے میں حائل نظر آتا ہے
اور آپ کو پانا مشکل نظر آتا ہے

عالم میں گراں مایہ بس دل نظر آتا ہے
پلہ یہ ترازو کا مائل نظر آتا ہے

جلدی ہے پہونچنے کی مجھکو درِ جاناں تک
اک اک قدم اب تو منزل نظر آتا ہے

گرداب سے رہ ہی کشتی کو بچا کر چل
کترا کے نکلنے میں ساحل نظر آتا ہے

ای ذوقِ نوا بھی پھیری ہی چھیری تو نے
طوطی پس آئینہ بسمل نظر آتا ہے

بس ایک ہی پرتو کا سارا یہ کرشمہ ہی
اب آئینہ خانہ بھی محفل نظر آتا ہے

دی آئینہ دل کو پرواز کدورت سے
اندیشہ خود بینی باطل نظر آتا ہے

کشتی ہو جو طوفانی اوس وقت خدا کو
منجھدھار سے لے کر تا ساحل نظر آتا ہے

بیدرد خدا سے ڈرتو اسکو نہ ای گلچیں
مجھ کو تو ہر اک غنچہ ایک دل نظر آتا ہے

بس نام ہی نام اب تو سنتے ہیں محبت کا
اس نقطہ کا بھی کوئی محمل نظر آتا ہے

گنجینۂ معنی ہی ضائع نہ کر اس دل کو
سب اس میں دو عالم کا حاصل نظر آتا ہے

حسن اور محبت کا لازم ہی نہاں رہنا
کب جان نمایاں ہے کب دل نظر آتا ہے

گر درد آہو ہی یا رنگ پریدہ ہی
جو نکہت سے لے کر تا محمل نظر آتا ہے

یا رب تو سویدا ہی کس کے دلِ پرخوں کا
برگ گل لالہ میں جو تل نظر آتا ہے

کشتی کو لگا دے پرای باد مراد آکر
آغوش کو پھیلائے ساحل نظر آتا ہے

خائن ہی وہی انسان اور ظالم و جاہل بھی
جو بار امانت کا حامل نظر آتا ہے

یارانِ سخن گو سب اہلِ نظم ہیں اہلِ دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ ——— فعلاتن معاعلن فعلات ——— ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے
حشر برپا کریں سحر کے لئے

سوزِ دل کیا کہوں کہ آپ آئے
آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے

جتنے عشوے تھے چشمِ ساقی میں
اوتنے ساغر حباب کر کے لئے

تیری زینت گہر سے کیا ہو گی
آبرو ہو گئی گہر کے لئے

پہلے جو دامن و گریباں تھا
اب ہے رومال چشمِ تر کے لئے

پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر
ہاتھ ملتا ہوں اب جگر کے لئے

دمِ رفتار حشر نے اوٹھ کر
قدم اوس شوخ فتنہ گر کے لئے

کیوں لگائی ہے ڈاب کافی تھا
ایک چھلا تری کمر کے لئے

نزع میں میں نے ہر طرف دیکھا
آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے

ہم تو سمجھے تھے زیست ہی کو عذاب
لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے

عرش کے کنگروں پہ نالوں نے
ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے

زاہد آئے جو بزم میں ساقی
رہنے دینا نظر گذر کے لئے

سر کو رکھے ہوں خاک در پہ ترے
کہ یہ صندل ہے دردِ سر کے لئے

کیا غضب ہو گیا اگر دیکھا
دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو
اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لئے

موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن
زادرہ چاہیئے سفر کے لئے

بے سروپا جو ہو کرے کیا فکر
پاؤں کے واسطے کہ سر کے لئے

کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب
بند مٹھی رہے جو زر کے لئے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظم
منتیں مانئے سحر کے لئے

۲۲۷ ——— ونہ ——— ۱۵

رازافشا کہیں نہ ہو جائے
فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے

حب دنیا کہیں نہ ہو جائے
دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے

کون واعظ کے منہ لگے جاکر
مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے

خون دل آتے آتے آنکھوں میں
تھوڑا تھوڑا کہیں نہ ہو جائے

دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو
یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے

خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے
حشر برپا کہیں نہ ہو جائے

ضبط نالے نہ کر دل بیمار
درد پیدا کہیں نہ ہو جائے

بڑھتے بڑھتے یہ کاکل شب رنگ
شب یلدا کہیں نہ ہو جائے

ناز کو ہے خیال پردہ دری
کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے

نہ لب بام مجھ کو زلو اوٗ
لب دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑیئے زلفیں
پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے

شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر
دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے

دل پر سوز پر نہ رکھو ہاتھ
ید بیضا کہیں نہ ہو جائے

صاف ہے چاندنی نہ الٹو نقاب
چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

اتنا دعویٰ نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

۲۲۸ ——— ولہ ——— ۱۳

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے
پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے

دن نہ گئے اگر مصیبت کے
ہم تھے مہمان چند ساعت کے

میرا ساغر رہا نہیں خالی
صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے

دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں
جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے

وقت پر تم نے لی خبر ورنہ
مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے

گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں
ہیں یہ آثار اہلِ جنت کے

مشت خاک اور ہما ہمی ایسی
کارخانے ہیں تیری قدرت کے

اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر
رہنے والوں سے دشت غربت کے

فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس
جھلملائے چراغ تربت کے

کھل گیا رازِ دل کہ مدفن پر
پھول نکلے جگر کی رنگت کے

آدمی آدمی کے کام آئے
یہی معنی ہیں آدمیت کے
حشر پر رکھا وعدۂ دیدار
یہ کنائے ہیں کس قیامت کے
اپنے مذہب میں ہے یہی توحید
نظم بندہ ہیں ہم محبت کے

۲۲۹ ——— فعولن چار بار ——— ۱۲

جو نالے لب پہ پیر کنعاں سے نکلے
لئے ساتھ یوسف کو زنداں سے نکلے
اجل پر ہی تہمت قضا پر ہے بہتاں
یہ سب شعبدے چشم فتاں سے نکلے
وہ نازک طبیعت ہی نامہ ہوا ایسا
کہ طومار مضمون عنواں سے نکلے
اوتر آئے وہ پیچ سب میرے دل میں
جو کافر کی زلف پریشاں سے نکلے
کسی کو غش آجائے وقت نظارہ
ہوا بھی نہ ظالم کی داماں سے نکلے
عنادل کریں جب ہزاروں ہی نالے
تو اک آہ لبہائے خنداں سے نکلے
کھلا مجھ پہ واعظ کا زہد ریائی
یہ حضرت بھی کچھ نا مسلماں سے نکلے
جنھیں رند و بے باک سمجھا تھا زاہد
وہی لوگ کچھ اہل عرفاں سے نکلے
ق
کبھی ابر کے ساتھ پھرتے تھے ہم بھی
خیاباں میں پہونچے بیاباں سے نکلے
چھڑاتے ہوئے شاخ گلبن سے دامن
او جھجکتے ہوئے سنبلستاں سے نکلے
کبھی گل کے رخسار پر منہ کو رکھا
کبھی بھڑکے سرو گلستاں سے نکلے
غرض یہ کہ بزم خرابات میں بھی
گئے اور رہو کر پشیماں سے نکلے

۲۰ ——— ۱۲

اگر گوش گل تک رسا ہو گئی — تو شبنم دُرِ بے بہا ہو گئی
مری نامہ بر باب صبا ہو گئی — ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی
یہ تھی فرصتِ عمر یا شمع تھی — ذرا جھلملائی فنا ہو گئی
نہ ہو حکم مبرم کہا اس نے کن — عیاں فصلِ ماسوا ہو گئی
سیاہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی — سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی
کرو قافلہ تک پہونچنے میں کد — بہت دور بانگِ درا ہو گئی
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں — غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی
ہے آپس میں اب تو عناد و نفاق — محبت وہ اگلی سی کیا ہو گئی
گری تھی ابھی برق بنکر نگاہ — اوٹھی گر کے تیغِ قضا ہو گئی
نظر کا نظر سے ملانا تھا — لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی
زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں — اجل آتے آتے جفا ہو گئی
ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے تلف — جوانی تو رنگِ حنا ہو گئی

۲۳۱ ——— فاعیل مفاعلن مفاعیل ——— ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے — امت مطعون ہو گئی ہے
کیا کہنا تری دعا کا زاہد — گردوں کا ستون ہو گئی ہے
رہنے دو اجل جو گھات میں ہے — مجھ پر مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبار دل میں ڈھونڈھو — زندہ مدفون ہو گئی ہے
وحشت کا تھا نام اوّل اوّل — اب تو وہ جنون ہو گئی ہے
واعظ نے بری نظر سے دیکھا — مے شیشہ میں خون ہو گئی ہے
عارض کے قرین گلاب کا پھول — ہمرنگ کی دون ہو گئی ہے
مل کر دیو و ملک کی سیرت — طرفہ معجون ہو گئی ہے
بندہ ہوں ترا زبان شیریں — دنیا ممنون ہو گئی ہے

حیدر شب غم میں مرگ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲۰ ——— تضمین دعائیہ ——— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازوار رہے — اساس دولت و اقبال پائدار رہے
یہ اوج منزلت و جاہ برقرار رہے — ہمیشہ خلق میں عثماں ترا وقار رہے

نبی کا لطف رہے فضل کردگار رہے

فروغ مہر پہ چمک کرے نگین دکن — چمک سے جس کی فروزندہ ہو جبین دکن
فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چین دکن — عروج پائے ترے دم سے سرزمین دکن

ترے قدم کا سر آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہے اوج موج شوکت میں — اسی طرح سے رہے لہر دولت میں
یونہی نسیم طرب گل فشاں ہو صحبت میں — خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغ عشرت میں

خدا کرے کہ ہمیشہ یہی بہار رہے

ہمیشہ سایہ رہے تیرا ملک و ملت پر | ہمیشہ دست عطا زر فشاں رعیت پر
کرم کی شان رہے اس عروج و رفعت پر | نگاہ لطف ہو وابستگان دولت پر
یہ باہمی جو تعلق ہے خوشگوار رہے

رہے جہاں میں تو حامی دین و دولت و داد | رہے خزانہ زر افشاں ہمیشہ ملک آباد
رہے زمانہ میں سرسبز تیرا باغ مراد | رہے نہال ترے سایہ میں تری اولاد
تری امید کا ہر نخل برقرار رہے

جو خیر خواہ کے حق میں کرم ہے رشک سحاب | نگاہ قہر بداندیش کو ہے برق عتاب
نہ مثل تیر ہے کرم کا نہ ہے ستم کا جواب | برنگ گل تر و تازہ رہیں ترے احباب
مثال زخم عدو تیرا دل فگار رہے

رہے مدام درخشندہ اختر طالع | کہ خیر خواہ کریں شکر نعمت صانع
یہ عرض نظم کی ہے جو ہے بندۂ تابع | دعا ہماری یہ دل سے ہے آصف سابع
مدام ملک دکن کا تو تاجدار رہے

۲۳۳ — غزل و قصیدہ بمدح خسروی — ۱۳ ش

دزدیدہ نگاہیکہ پہ تیر قضا داشت | دل از کف من برد و جفا کرد و روا داشت
در دیدہ و دل شوق فراوان تو جا داشت | ایں ذوق جفا داشت و آں حکم وفا داشت
دل مغز فغاں و آں طرف فارض و سما داشت | وہم است ترا ایں کہ بپہلوئے تو جا داشت

هرچند که گردون هوس جور و جفا داشت
از فکر بیاسود دل من که خدا داشت

تا عکس خود افگند بشوخی و رواں شد
آئینهٔ او حیرت نقش کف پا داشت

در دست حنا بستهٔ او دزد حنا بود
این وزد ندانم ید بیضا ز کجا داشت

خون حنی و عربدها کردی و شادم
دانم که برین کار ترا ناز و ادا داشت

چون قافلهٔ هیم خرد و هوش رواں شد
رنگیکه پرید از رخ من بانگ درا داشت

فریاد ازین عاقبت طالب دنیا
میرفت بسوئے عدم و رو بقفا داشت

آں طائر ناداں که بقید قفس آمد
بے چاره ندانست که در پیش چها داشت

دل دوخت بناوک کشش سرمهٔ جادو
دنبالهٔ او ره ز کجا تا به کجا داشت

در دولت این خسرو عادل عجب انیست
دیدم صف مژگاں که دو صد فتنه بپا داشت

برجستم و این مطلع برجسته بخواندم
پیش شه ذیشاں که لقب ظل خدا داشت

۲۳۴ ——— (مطلع) ——— ۱۱

صد لطف بهر عاجز و مسکین شه ما داشت
شه دست کرم داد او دست دعا داشت

هنگام تکلم لب لعلش گهر افشاند
هر گوهر غلطاں بگره آب بقا داشت

صد نکته فزود است بدیوان سیاست
صد عقده کشود است بفکریکه رسا داشت

آوازه شنیدیم و دیدیم بسویش
سنگ ره او منزلت کوه صفا داشت

تا رایت اقبال تو بر اوج ظفر تافت
افشاند براهش پر و بالے که هما داشت

تا عدل شهی مژده امنے بجهاں داد
تائب شده گردوں که سر جور و جفا داشت

از مکرمتش ملک دکن تازہ جواں شد
شمشیر و کمر داد بہ پیرے کہ عصا داشت

با معدلتش دست ضعیفاں بہ گرفتست
دیدم پر کاہے کشش کاہربا داشت

تا از نعمت باد بہاری بوزیدست
گلزار دکن از سر نو منشو نما داشت

بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا
دیدند کہ او پایہ گل و سر بہ ہوا داشت

صد بار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بارے بہ صف حاشیہ بوسان تو جا داشت

۲۳۵ (نظام گزٹ سے منقول ہے) ۷

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کر،
اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی
تاریخ اوراق روزگار و صفحات قلوب پر ابد الآباد تک نقش رہے گی
جسکی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصاء زبان و قلم کے حیطۂ امکان
سے باہر ہے یہ ترانہ ساگرہ بامتثال امر باری زبان قلم پر جاری
ہوا۔

آٹھ سعین قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوشِ گل جوشِ طرب جوشِ بہار است اینجا
گل فشاں نغمہ زمنقار ہزار است اینجا

از چراغاں شدہ ہر کوچہ و ہر زاں پہ نور
کہکشاں جادہ ہر [illegible] ارست اینجا
شعلۂ ورشۂ شمع ست بہم پیوستہ
تاج زریں ز طرب بر سر خارست اینجا
من کہ در ظل خدا نور خدا می بینم
چشم بر ہم نزنم جلوۂ یار است اینجا
شام یک مژدۂ امن ست و سحر مژدۂ عیش
ہر دو پیک اند مگو لیل و نہار ست اینجا
شب این جشن و فلک عقد ثریا در دست
یعنی این سلک گہر بر نثار ست اینجا
نغمۂ نظم کجا بار دریں بزم کجا
مجمعے خوش ز امیران کبار ست اینجا

۲۳۶ ملمع ۴۲

وارفتۂ حرف حق ہیں اہل توفیق | غفلت بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
یہ موعظہ پیر طریقت سمجھو | طبتم اخذتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے | سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کرلیں
پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے
آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ
شاہی کا نگیں ہے نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کئے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی
انصاف خدا کے ہاتھ ہے وہ تو سہی
مظلوم بھی ہے داورِ محشر بھی ہے
ظالم نطقاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنی برجستہ ہیں سب بندھتے ہیں
جب بندھتے ہیں مضمون عجب بندھتے ہیں
ہیں کم سخن اس سے ہوں کہ شیریں ہے کلام
کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتے ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو
یہ طائرِ جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمر بشر چند نفس کی میعاد
جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے
اور طولِ امل فسوں و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے غصہ سے گریز
وہ خوک ہے اور یہ سگِ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو رہے
زر پائے مگر گلوں میں نکہت تو رہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھو
دولت تو نہیں رہی شرافت تو رہے

رباعی

دعویٰ ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں
بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی
خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک
خطرے لاکھوں ہیں اور خاطر ہے ایک
حرص۔ آز حسد عجب غضب جہل ہوس
سا تا روہن ہے اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطریں مدارتیں ہیں
دل میں بیٹھا ہے چور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ
جتنے منہ ہیں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں
اب تک نافہمیوں سے چیتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری میری دیکھا دیکھی
اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں تکریس و پیش نہیں
یعنی کہ مقدر میں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ
اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گذر جاتے ہیں
جو دل میں آگئی وہ کر جاتے ہیں
اچھے نہیں اطوار ہمارے اے نظم
لوگ ایسے ہی جواں مر جاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں
پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آبِ شور ہے یہ دنیا
میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا
یہ جسم کہیں خاک میں مل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری ہم نے
مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تالبِ گور عمر بھر میں آیا
دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مڑوڑا مجھکو
جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اصلا ہوگا
پھر خاک سے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر اک شخص ہے مست
یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی
باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت
سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جا کے گور کی منزلیں
خالی تھی جگہ ان کے لئے تو دلمیں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سُنانے اے نظم
افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلیحضرت خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے
عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس
زہے فروغ کہ یوسف ملا زلیخا کو
تو جا کے بزم میں اے نظم عقد کی تاریخ
یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
(۱۳۴۱ھ)

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہمتم
رساند ذروہ اعلیٰ بہ اوج مریخش
نوشت نظم دعا گو چو دید بنیانش
کہ ھٰذہ الکتب القیمۃ ست تاریخش
(۱۳۴۹ھ)

تاریخ ترجمہ وکار آف ویکیفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا
واقعی باتیں لباسِ داستاں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی
ہے فرنگن زیورِ ہندوستان پہنے ہوئے (۱۳۰۲ھ)

تاریخ طبع دیوان میرزا کرحسین یاس مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے
ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام
پتھر سے چشمۂ معانی نکلے (۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا
حسن میں ہے غیرتِ ناہید یہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا
آگیا ہے گود میں خورشید یہ (۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے
لکھے کیا پر ضیا و روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں
قلم کا ہے سواد ابرِ گہربار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں
جھل ہے عقد مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصراع تاریخ
یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار (۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب
سب سخنور محوِ نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین
کہہ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے (۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نبو صاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین
کہنا اس طرح ہے قابو میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے | سحر اسیا ہوا اس اردو میں جسے کہتے ہیں
(۱۳۰۰ھ)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہے تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لئے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا:-

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے"
(۱۳۳۶ھ)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستن[1] موت و حیات | حیف یہ عبرت کدۂ ایرماں[2]
جو کوئی اس دار فنا سے گیا | پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں
اوٹھ گیا اس بزم سے حیف ایک امیر | باذل و ذی رتبۂ والا مکاں
رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر | مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں
غم سے بُرا حال ہے احباب کا | درد و الم دل میں ہے لب پر فغاں
نام بھی مرحوم کا تاریخ بھی | ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے
کوچ کیا سوئے نعیم جناں
(۱۳۲۸ھ)

---

[1] آبستن بمعنی حاملہ [2] ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی سترھویں رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظم فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیر ہے دنیا میں فرقت سے علی کی
(۱۴۲۰ — ۱۱۰۰)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمہ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفَقیہُ الالمعیُّ المقتدیٰ
وقد استباحَ الکنزَ مِنْ عُلیا التقیٰ
مذ لم یزل للدین قائمۃ و رکن
للھدایۃ و الزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجاتِ الشریعۃ قد ھوت
وسراجُ انوارِ الھدایۃ قد خبیٰ
ارخت عام الارتحالِ بمصرع
لتزلزلت و اللہِ ارکان الھدیٰ
(۱۲۹۸)

تاریخ وفات سید بلگرامی مرحوم

ہوش نے رامپور سے لکھا
کہ ہے رنج و غم و الم کا ہجوم
ان کے والد نے انتقال کیا
اور تاریخ میں کروں مرقوم
پڑھ کے خط میں نے کہہ دیا دو بار
سید بلگرامی مرحوم

سہرا بتقریب عروسی آغا سید حسن اطال اللہ عمرہٗ

سر پہ نوشہ کے جو ہے دُرِ عدن کا سہرا
عکس سے لب کے بنا لعل یمن کا سہرا
سر پہ آنچل جو پڑا ہو گیا دونا جلوہ
کہ ہے سہرا پہ دوپٹہ کی کرن کا سہرا
دُرِ شہوار چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
موتیوں کا ہے کہ پروین و پرن کا سہرا
چشمکیں کرتا ہے جھرمٹ پہ ستاروں کی کبھی
اور کبھی رنگ اوڑاتا ہے چمن کا سہرا
سب پڑھیں سورۂ اخلاص کی جا سورۂ طور
اک تجلی ہے رخ جلوہ فگن کا سہرا
کیا چمک طرۂ دستار پہ نوشہ کے ہے
جس سے شرما گیا گھونگٹ میں دلہن کا سہرا
یہ تجلی کسی نوشہ میں نہ دیکھی ہو گی
سر پہ خورشید کے جب سے ہے کرن کا سہرا
آئینہ بیچ میں دیکھا کیا یہ راز و نیاز
اولجھا نوشاہ کے طرہ میں دلہن کا سہرا
گل عارض کی صباحت کا مسلسل ہو جو ذکر
یہ غزل ہو گل نسرین و سمن کا سہرا
بارِ دور تو نے کیا تحفہ تمنا یارب
تو نے دکھلا دیا اس رشک چمن کا سہرا
جوہری نے بھی نہ اس طرح پروئے موتی
جس طرح نظم نے لکھا ہے حسن کا سہرا

عبارت خاتمہ

یہ سب غزلیں شاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں میں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا، ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔

خدا زہد پرست و رہبان منش لوگوں کی نظر بد سے اس نگارستان معانی کو بچائے!

حورٌ مقصوراتٌ فی الخیام کانھن اللولؤ المکنون

جلنا من ابکاراً عرباً اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم حوریں (اعرابیہ بدویہ)
گویا کہ وہ درمکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا
ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہ محمد عبدالستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

چند علمی کتابیں

مقدمات عبدالحق | مولوی عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کو مقدمہ نویسی و دیباچہ نگاری میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ یہ مولانا کے کل مقدمات کا ایک بیش بہا گراں قدر اور نایاب مجموعہ ہے جس میں مذہب و فلسفہ تاریخ و تذکرہ زبان و ادب مختلف موضوعات پر وہ عالمانہ اور بسیط مقدمے ہیں جو ارد و زبان کی متعدد بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ہیں اور جو بجائے خود بھی اپنے موضوع پر فاضلانہ مقالے ہیں قیمت حصہ اول (دے) حصہ دوم (عاں)

مثنویات میر

مرتبہ مولوی سید محمد ام اے یہ اردو شاعروں کے سرتاج میر تقی میر کی جملہ مثنویات کا مجموعہ ہے جو متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے اور بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ترتیب دیا گیا ہے یہ مثنویاں اپنی اعلیٰ شعریت کی وجہ سے اردو ادب میں شاہکار ہیں مثنویات میر جامعہ عثمانیہ کے امتحان ام اے اور دوسری جامعات کے اعلیٰ اردو نصاب میں شریک ہیں لائق مرتب نے بڑی صحت کے ساتھ مثنویاں ترتیب دینے کے علاوہ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے اور میر صاحب کی سوانح حیات ان کے کارناموں اور مثنویات پر بلند پایہ تعمیری تنقید بھی کی گئی ہے

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

غلطنامہ "صوت تغزل"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	فرد و بشر	فرد بشر
۴	۸	قیامت	قیامت
"	۱۲	سرخد	سرمد
"	۱۴	موبد	موبد
"	آخری خفی	دو انگلیال	دو انگلیاں
	پہلی سطر	لغت میں موبد دونوں طرح	لغت میں موبد دونوں طرح
	دوسری		
۵	۱۵	تعالی اللہ	تعالی اللہ
۶	۳	کہاں ہے	کہاں ہے
"	آخری خفی سطر	[illegible]	[illegible]

۱۳	۱۷	اس قدر لی چٹکیاں	اس قدر لیں چٹکیاں
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا	ہوئی الجھن بڑھا
۱۷	۷	شُعاع	شعاع
۲۲	۴	دھوت	دھوپ
۲۸	۲	کب اُس	کب اِس
۔	۷	(۱۷) ولہ	(۱۷) ولہ ۱۹۱
۳۳	۱۲	نہس یک	ہنیں اِک
۳۴	۳	ہوُا	ہوا
۳۵	۷	ہٹی	مٹی
۳۹	۱	×	فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات
۔	۹	مجھ کو	تجھ کو
۔	۱۲	جویارانہ	جو یارانہ
۔	۱۵	دن چڑہا	دِن چڑھا
۴۱	۷	میں	ہیں
۴۳	۱۶	نازہے	نازسے
۴۵	۷	آہوں	آہو
۔	۹	ڈھلنا	ڈھلتا

۴۵	۱۳	بھی نہ الٰہی	بھی الٰہی
"	۱۷	آئے	آکے
۴۶	۱۲	مور بلخ	موزو بلخ
"	۱۴	عالم وجد	عالم وجد
۴۹	۴	مزا	مزا
"	۷	مضر	مقر
۵۰	۵	ہوگا	ہوگیا
"	۱۴	نظمۂ	نطمۂ
"	۱۵	نے لے	سے خضر لے
۵۱	۱۳	برق رہ گئی	برق بھی رہ گئی
۵۲	۱	گئے	گئے
۵۵	۱۲	شبۂ	شہۂ
"	۱۷	اژدحام	ازدحام
۵۶	۱۲	بہ بزم جلوہ اخ	اگرچہ رخصت اخ
"	۱۳	اگرچہ رخصت اخ	ہوائے ابراخ
"	۱۴	ہوائے ابراخ	بہ بزم جلوہ اخ
۵۷	۶	سیحا	مسیحا

۵۸	۷	قائل	قابل
″	۱۳	گیارا	گوارا
۵۹	۱۵	مٹھکا	کھٹکا
۶۰	۱۵/۱۶	حیف بندہ	حیف بندہ
″	″	حال معلوم	حال معلوم
۶۲	۱۴	کو	لو
۶۳	۲	گرہ	گریہ
″	۴	لیا	گیا
۶۵	۱۴	کہ	کے
۶۷	۲	یگانا	لگایا
۷۰	۱۴	مشکے بو	مشک بو
۷۱	۱۴	بھلا	بہلا
۷۲	۵	جوآپ	جواب آیا
۷۶	۴	۳۷	۲۳
″	۸	سرگہ	ہرگہ
۷۷	۱۲	بگزریم	بگزرم
۷۹	۱		۶۰ ۱۴

۷۹	۳	عشقش بیاسائم	عشقش بیاسائیم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	لہ	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال وپری	بال پری
"	۱۴	عزض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زمیں	کیطرح ولہ زمین
۸۷	۲	دور باش	دور باش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک وبو	مشک بو
۸۹	۵	کشتی	کشتی
"	۱۱	صد	پیر
۹۰	۹	دست ویا	دست وپا
"	۱۲	مائم	مائیم
"	"	ما عمر	ما بہ عمر

۹۱	۱۵	نفس	نفس اتارہ
۹۳	۵	تھی	تھے
〃	〃	حلاحل	جلاجل
۹۶	۷	لغزش	لغزش
〃	۶	تعزیر	تعزیر
〃	〃	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پہرا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجانے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	میں
۱۰۰	۶	افسانہ پہر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یانہیں	بانہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سی	کہ اسے
〃	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پرسر	تیرپر
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
〃	۴	ارسی	آرسی

۱۰۷	۹	صبر ے	صبر نے
۱۱۶	۱	کہیں	کھُلیں
"	۶	گرتاب	گرداب
۱۱۷	۱	میں بشر	میں ہے بشر
"	۱۷	گرساں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۹	۶	ادھر	اُدھر
"	۱۶	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	برزخ	برزخ
"	"	لکا	رُکا
"	۴	پڑھ گئے	پڑ گئے
"	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشہ یلیلا	تشنہ لبہا
"	۱۴	بکشم	بُکشتم
۱۲۳	۹	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
"	"	تھائے	کھائے
"	۱۷	باندھے ہو	باندھے رہو

۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
"	۱۲	نشترہ	نشتربہ
"	۱۶	کعبہ ونبر	کعبہ منبر
۱۴۷	۶	سکوسن	سکون
۱۴۸	۲	وہی حقلاسی کمرہ کی نہیں	وہی چھلاسی کمرہ کہ نہیں
"	۱۵	سنسان	سنسان
۱۴۹	۳	نگہ مار	نگہ یار
"	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	ماتی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	منت ہستی کوکیا	منت ہستی کیا
"	۶	کہ یہ	کہ یہ
"	۱۵	توپہ	تویہ
"	۱۶	ادا سمجھوے	ادا سمجھائے
"	۱۷	متجب	تعجب
"	"	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہرسو	کہ ہرسو

۱۵۵	۱۵	ہی ہی	ہی ہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرا عبرت سے
۱۵۷	۱	چڑہتے	چڑھتے
۱۶۱	۲	درو گوہر	زرد گوہر
"	۶	ہونکہ	ہوں کہ
"	۸	ٹہرائے	ٹھہرائے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش وغنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	ہوگھ	ہو گھر
۱۶۶	۳	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ہلال برق	ہلال و برق
"	۱۱	ریک	ریگ
۱۷۲	۳	نبرش	بہ برمش
"	۱۵	میں	میں ہے
۱۷۶	۱۵	یھی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیر بھی سے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دور سے	درد سے

۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	تیزمانے	میں نے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۷	۱	دود آآہ	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	حبص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزاد بھی	آزاد ابھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیرو خورلق	سدیرو خورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی میں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	بچلے	بچائے

۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	مٹنے	ہٹنے
۲۱۸	۱۲	خود نمائی ہے کا	خود نمائی کا ہے
"	۱۶	نمایشے	نمایش ہے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صدا ااالٹی	صدا الٹی
۲۳۰	۹	چشم بز	چشم تر
۲۳۸	۸	کرہ	گر
۲۳۹	۹	داد	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
"	۸	لذت	صوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سجرے	سجہ ہے
"	۱۳	نسر	سحر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
"	۸	وہ	جو

۲۴۹	۱۶	ستوں	کشتوں
"	۱۷	ہمیں	کہیں
۲۵۱	۳	چاکر	چاہ کر
۲۵۶	۱۰	شک	سنگ
"	۱۶	شک	اشک
۲۵۷	۹	تو	کو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں	اونگلیاں
۲۶۰	۵	پلنو	پلٹنے
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے	دیکھی جو ہے
۲۶۴	۱۳	حسن	حسن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر	دل کو کہ دہر
۲۶۷	۱	بھی	بہی
۲۶۸	۴	سائیتن	سانگیں
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری	جفا کاری
۲۷۳	۲	سازی	ساری
"	۴	فلاف	لاف
"	۱۰	نواز	ناز

۲۷۳	۱۲	بیش		پیش
۲۷۶	۱۷	گردبادادوھ		گردبادادوٹھ
۲۷۷	۶	کی		کو
"	۹	ولہ		قطعہ
"	۱۴	زنبیں		زمینیں
"	۱۷	نیساں		نیستاں
۲۷۸	۱	۲۱۰	۲۵	۲۱۰ — ولہ — ۲۵
۲۷۹	۹	جائے		جائیں
۲۸۱	۱۷	رنکھے		رکھے
۲۸۳	۱۷	بہت		بہت سے
۲۸۴	۶	اُس یہ		اُس پہ
"	۱۷	ہے		تھے
۲۸۶	۱	۲۱۴	۱۳	۲۱۴ — ولہ — ۱۳
۲۸۷	۲	کہ ناصح		کہ کیوں ناصح
"	۵	کا		کو
"	۱۷	تفش		نقش
۲۸۹	۱	۲۱۶	۱۲	۲۱۶ — ولہ — ۱۲

۳۸۹	۱۷	کہا	کیا
〃	〃	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	متک	مہ تک
۲۹۱	۶	گتر	گر
〃	۱۱	اتنا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۶	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرداز
〃	۱۴	دل بہ یار	دل بیمار
۳۱۲	۵	مثل	محفل
۳۱۷	۱۵	طبتم اخذتم علیہا اصری	لِحُبّتم اَخذتم علیہا اِصری

مطبع انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس